متاعِ نور

سنہ اشاعت : ۱۹۸۸ء

بار اوّل : دو ہزار

قیمت : ۵۰ روپے

خوش نویس : سید عتیق احمد

طابع : لبرٹی آرٹ پریس،
دریا گنج، دہلی

ناشر:

ساون کرپال پبلی کیشنز

وجے نگر ، دہلی ۱۱۰۰۰۹

MATA -E- NOOR
Rs. 50/-

DARSHAN SINGH
Collection of Ghazals

SAWAN KIRPAL PUBLICATION
VIJAY NAGAR, DELHI-110009

متاعِ دیر اگر داریم بر ما رد مکن زاہد
بہ عزمِ کعبہ میرفتیم راہِ کارواں گم شد

(نظیریؔ)

مصنف	درشن سنگھ
پیدائش	۱۴ ستمبر ۱۹۲۱ء
وطن	سید کسراں، ضلع راولپنڈی، پنجاب (پاکستان)
تعلیم	بی. اے. (آنرز) پنجاب یونی ورسٹی۔ (گورنمنٹ کالج لاہور)
شغل	ڈپٹی سکریٹری گورنمنٹ آف انڈیا (ریٹائرڈ)
مشورۂ سخن	۱. صوفی غلام مصطفٰے تبسم ۲. حضرت شمیم کرہانی

انتساب

اپنی رفیقۂ حیات

ہر بھجن

کے نام جو

مرشدِ پاک حضور بابا ساون سنگھ جی مہاراج

اور

حضور پُر نور سنت کرپال سنگھ جی مہاراج

کے فیضِ بے پایاں کی بدولت

معرفت اور حقیقت کی راہ میں

میری ہمسفر ہیں

اور

خدمتِ خلق میں

میرے شانہ بشانہ شریک ہیں

درشن

ترتیب

○ غزلیں

متاعِ نور

رازِ نہاں تھی زندگی، رازِ نہاں ہے آج بھی
وہم وگماں ازل میں تھی، وہم وگماں ہے آج بھی

یہ کائنات ایک رازِ سربستہ ہے، زماں ومکاں کی لامحدود وسعتوں میں پھیلی ہوئی یہ کائنات نامعلوم زمانوں سے اپنی گوناگوں نیرنگیوں کے باعث انسان کو متحیر کیے ہوئے ہے۔ انسان جس کا وجود خود ایک راز ہے۔ اور جو آسماں در آسماں اور کہکشاں در کہکشاں پھیلی ہوئی کائنات کے ہزار ہا سیّاروں میں سے ایک سیارے کی ایسی مخلوق ہے جسے اپنی ابتدا معلوم ہے نہ انتہا ؎

سُنا فسانۂ ہستی تو درمیاں سے سُنا
نہ ابتدا کی خبر ہے نہ انتہا معلوم

اور اس سیارے پر بھی وہ ہزار ہا قسم کی مخلوقات میں سے ایک ہے۔ مگر اشرف المخلوقات۔ یعنی اس لامحدود کائنات کے آسمانوں، ستاروں اور آبادیوں وروِیرانوں میں کوئی متنفس اس سے بڑھ کر نہیں۔ اس سے بہتر نہیں۔ اسے خالقِ کائنات نے یہ مرتبۂ عظیم عطا فرمایا اور حکمِ خداوندی سے فرشتوں نے اسے سجدہ کرکے اس کی عظمت

کا اعتراف کیا۔ خالقِ عالم نے اسے فکرو دانش کی دولتِ بے بہا تفویض کر کے اسے ممتاز فرما دیا۔ مگر یہی امتیاز اس کے ہمہ وقت اضطراب اور تجسّس کا باعث بن گیا۔ اس نے عالمِ وجود میں آکر اپنے چاروں طرف پھیلی ہوئی کائنات کو نگاہِ تحیّر سے دیکھا، اور پھر سوچنا شروع کیا اپنے اور کائنات کی دیگر اشیائ کے باہمی تعلق کے بارے میں۔ مگر اس کے خیال کی پرواز محدود ہو گئی، جب اسے احساس ہوا کہ اس ہزار رنگ کائنات ور زندگی کے مظاہر کی تخلیق میں کسی لامحدود قوّت کی صناعی کا ہاتھ ہے۔ اس کے فکر کی راہیں محدود ہو گئیں، مگر اس کی جستجو کی پیاس اور بڑھ گئی اور وہ اپنی کم مائیگی کے باوجود خالقِ کائنات کی خلوت تک پہنچنے کی مسلسل جدوجہد کرنے لگا، اس نے اپنے علم و دانش کا تمام خزانہ داؤں پر لگا دیا مگر وہ ہنوز سرگرداں ہے اور وہ آج تک اس راز کا سرا نہ پا سکا کہ آخر خالقِ کائنات اور اس کا رشتہ کیا ہے۔ اور اس صنّاعِ عالم نے آخر یہ کائنات کیوں بنائی، اور پھر اس کائنات کے ایک گوشے میں اسے پیدا کر کے اور فکر و احساس کی دولت عطا کر کے محض ایک جلوہ گری کی یا اس کی تخلیق میں کوئی مقصد بھی پوشیدہ ہے، اور اگر مقصد ہے — تو کیا ہے —؟ ان تخیلات، تصوّرات اور لاینحل سوالات کے ساتھ وہ زندگی کے تسلسل کے دائرہ میں روزِ اوّل سے سرگرداں ہے۔ اس نے ہزارہا صدیوں کے دوران علم و دانش کے گہر ریزوں سے تہذیبِ انسانی کا دامن بھر دیا۔ متضاد فلسفوں اور کائنات کے متعلق اپنے گوناگوں نظریات کی روشنیوں سے دنیا کو چکا چوند کر دیا۔ مگر درصل وہ اس وقت تک تاریکی میں ہے —— اس کی رسائی نورِ ازل تک نہ ہو سکی جس کے فیض سے سیکڑوں سورج، ہزارہا چاند، لاکھوں ستارے، رنگا رنگ مخلوق اور خود عقلِ انسانی عالمِ وجود میں آئی۔

بشریّت کی معراج یہ تصور کی گئی کہ اسے اپنے معبود سے زیادہ سے زیادہ قرب حاصل ہو اور اس فکر و جستجو میں انسان نے کائنات کو مسخر کرنے کا بیڑا اٹھایا۔ اس نے گہرے

سمندروں کو اپنی جولانگاہ بنا لیا، پہاڑوں کو زیرِ پا کر لیا، ستاروں پر کمندیں ڈال دیں، روئے زمین کی ایک ایک چیز کی ماہیت، تاثیر اور ذائقہ کا ادراک کر کے اسے اپنی ملکیت قرار دے دیا، اپنے مصرف میں لے آیا۔ مگر ذاتِ خداوندی کے رازِ سربستہ سے وہ کوئی پردہ نہ اُٹھا سکا۔ شاید اس میں رضائے خداوندی شامل تھی کہ وہ اس کی تلاش میں سرگرداں ہو اور اس واسطے سے دنیا کے علم و آگہی میں اضافہ کرے۔ اور پھر ادراک کرے خدائے لامحدود کی ذاتِ والاصفات کا ؎

وُسعتِ کائنات کی سیر کا ماحصل تو ہے
تیرے ہی در پہ آئے گا کل یہ تھکا ہوا بشر" (دوردرشن)

قابلِ تعظیم ہیں وہ انسان جنھوں نے ذاتِ خداوندی سے قُرب حاصل کرنے کی آرزو اور جستجو میں اپنی عمریں گزار دیں۔ دراصل یہی عمل روحِ تصوّف ہے۔ اس پاکیزہ جذبے نے مذاہبِ عالم کی تشکیل میں نمایاں کارنامے سرانجام دیئے۔ اور یہی وہ مقدس آرزو ہے جس کی شمع ہر زمانے میں رِشیوں، صوفیوں، مہاتماؤں، درویشوں اور مقدس بزرگوں کے سینوں میں جلتی رہی ہے، اور روحانیت کی مشعلیں روشن کیے ہوئے ہے۔

جستجوئے حق میں ریاضت خاموش رہ کر بھی کی جاتی ہے۔ انسان باری تعالیٰ کے تصور میں محو ہو کر دنیا سے ہی بے نیاز نہیں، بلکہ خود فراموش بھی ہو جاتا ہے۔ پہروں مراقبے میں رہتا ہے۔ مگر جب جستجوئے حق میں ریاضت لفظ و آواز کی صورت میں کی جاتی ہے تو وہ آواز نعرۂ مستانہ بن جاتی ہے۔ وہ لفظ۔ شعر کے پیکر میں ڈھل جاتا ہے اور لبِ اظہار پر آ کر نغمہ بن جاتا ہے۔ سحر انگیز ہو جاتا ہے۔ اور صرف شاعر ہی کو نہیں۔ پورے معاشرے کو متاثر کرتا ہے ؎

دل سے نکل کے ہر صدا کیوں نہ دلوں میں ڈوب جائے
سازِ مرا لطیف ہے نغمہ ترا لطیف تر (درشن)

دنیا کی اعلیٰ شاعری کا بیشتر حصہ خدا شناسی اور اس کے واسطے سے خود شناسی کے متصوفانہ مضامین پر مشتمل ہے۔ اور چونکہ یہ موضوع کسی ایک فرقے، کسی ایک زبان، کسی ایک قوم یا کسی ایک ملک کا موضوع نہیں ہے، بلکہ اس کا دائرہ انسانی سماج کے دائرے کی طرح وسیع ہے۔ جو شاید کُل روئے زمین سے گزر کر چاند ستاروں تک بھی پہنچ جاتے۔ اس لیے اس کی مقبولیت بھی ہمہ گیر ہے۔ اور چونکہ اسرارِ خداوندی ہنوز سربستہ ہیں، اس لیے ابتدائے آفرینش سے آج تک متصوفانہ مضامین اور شاعری وقت کی آواز معلوم ہوتی ہے۔ وہ آواز جو ان کے دل کی دھڑکنوں سے ہم آہنگ ہے۔ شاعری کے لیے ایک اور شرط ہے۔ دل کی آواز ہونا۔ اور جو شعر دل سے نہیں طلوع ہوتا وہ لفظوں کا مجموعہ ہو تو ہو۔ شعر نہیں ہوتا۔ تاثر سے خالی۔ بے کیف۔ شعر کی تخلیق کے لیے وجدانی کیفیت ہونا ضروری ہے۔ بالخصوص صوفیانہ اور عارفانہ شاعری کے لیے تو گدازِ دل لازمی ہے۔ ورنہ شعر میں الفاظ ہوں گے۔ وزن ہوگا، ردیف و قوافی ہوں گے مگر شعریت نہ ہوگی۔ روحِ شعر سے عاری صرف تجسیمِ الفاظ ہوگی۔

ایشیائی اقوام کی تہذیب کی تاریخ بہت پرانی ہے، اور اتنی ہی پرانی ہے خدا شناسی کی روایت۔ اس روایت نے اس خطۂ ارض پر پیغمبر اور رشی منی پیدا کیے۔ چنانچہ ایشیائی زبانوں کی شاعری میں تصوف کی جڑیں بہت گہری ہیں۔ اسرار و رموز کے دفتر پنہاں ہیں ایک ایک شعر میں۔ معانی کی وہ رنگا رنگی کہ ایک لفظ سے ہزار پہلو ہویدا ہوں۔ رومیؔ و حافظؔ، سعدیؔ و خسروؔ، کالیداسؔ و سورداسؔ، تلسیؔ، کبیرؔ، بابا فریدؔ، نانکؔ۔ غرض بلند پایہ شعرا کی ایک کہکشاں ہے جنھوں نے تصوف کو اپنا مسلک بنایا

اور لفظ و آواز کے ذریعہ جستجوئے حق کی راہ پر گامزن ہوئے۔ اور جنھوں نے اپنے کلام کے ذریعے حق شناسی کی مشعلیں بھی روشن کیں اور بندگانِ حق کی زندگی کے پہلوؤں کو بھی اُجاگر کیا اور انہیں راہِ نجات دکھائی۔ زندگی سے نبرد آزما ہونے کا درس دیا اور معاشرے کی اعلیٰ انسانی قدروں کو پیش کیا۔ 'متاعِ نور' کے تخلیق کار مہاراج درشن سنگھ اس عظیم روایت کی ایک کڑی ہیں جو اپنی عملی اور ہر لمحہ راہِ خدا اور خدمتِ خلق میں بسر ہونے والی زندگی کے تاثرات و تجربات، روحانیت کے کشف و کمالات اور عبد و معبود کے باہمی پُر اسرار معاملات کو آمیز کر کے یک گونہ بے خودی، سرورِ روحانی اور ناقابلِ بیان وجدانی کیفیات کے عالم میں شعر تخلیق کرتے ہیں۔ انہوں نے نہ صرف ایشیائی شاعری کی متصوّفانہ روایت کو آگے بڑھایا ہے بلکہ اسے روحِ عصر سے ہم آہنگ کر کے جدید دنیا کے فلسفوں اور پورے انسانی سماج کے بنیادی رشتوں سے ہم کنار کیا ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ ان کے وجد آفریں کلام کی تفہیم مشرق و مغرب میں یکساں طور پر کی جارہی ہے، جو اس امر کی ضامن ہے کہ ان کا کلام عالمی ادب کا ایک وقیع حصہ ہے۔ اور ایک ایسا روحانی سرچشمہ ہے جس سے تشنہ کامانِ ادب و ثقافت فیضیاب ہوتے ہیں۔ اور یہ سلسلۂ تفہیم زبان در زبان، ملک در ملک اور برّاعظم در برّاعظم جاری و ساری ہے۔

اگر عالمی ادب کے تناظر میں دیکھا جائے تو یہ بات بلا تردید کہی جا سکتی ہے کہ غزل وہ صنفِ سخن ہے جس میں داخلی کیفیات اور روحانیت کے اسرار و رموز۔ ایک لطیف پردہ داری اور تہ داری کے ساتھ بیان کیے جا سکتے ہیں۔ اس صنفِ سخن کی خوبی یہ ہے کہ یہ بظاہر نہایت آسان نظر آنے والا شعر ہر لفظ کے پہلو میں ہزار معانی رکھتا ہے۔ جیسے شانِ خداوندی کے مظاہر عام ہیں لیکن اگر نگاہِ نکتہ رس اس پر غور و خوض کرنا شروع کرے تو ہزارہا پردۂ اسرار جلوہ اور منظر کے درمیان محسوس ہوتے ہیں۔ دنیا کی تاریخ شاہد ہے کہ تصوّف کے مسلک کا ایک عظیم مرکز ایران رہا ہے اور بہت سی ثقافتی وجوہات کے باعث صنفِ غزل

کے فروغ کا سہرا فارسی شعرا کے ہی سر ہے۔ انہوں نے شعری روایت کو اتنا مستحکم کیا کہ ہزار ہا الفاظ کے لغوی معنوں سے کہیں زیادہ ان کے اصطلاحی معانی عام ہوئے اور غزل نادر تشبیہات، تلمیحات اور استعارات سے مزین ہو کر رمزیہ پیکر میں ڈھل گئی۔ ساقی شراب، میخانہ، پیمانہ، شیخ، برہمن، گل، بلبل، شمع، پروانہ، کشتی، ساحل۔ اور اس طرح کے بہت سے الفاظ جب شاعر کی وجدانی کیفیات کے ساتھ غزل میں ڈھلتے ہیں تو ان کے معانی لغوی معنوں سے کہیں زیادہ بلاغت کے حامل ہوتے ہیں۔ اپنے تاریخی تقاضوں کے ساتھ غزل جب اردو میں آئی تو نہ صرف فارسی کی شعری اور متصوفانہ روایت اپنے ساتھ لائی، بلکہ اس نے ہندستانی تہذیب اور فلسفہ کے جوہر کو بھی اپنے اندر جذب کیا، اور جس طرح تصوّف اور ویدانت نے شیر و شکر ہو کر ہندوستان میں روحانیت کی ایک نئی فضا پیدا کی، اسی طرح اردو غزل نے اس امتزاج کو اپنے لیے باعثِ فخر سمجھا اور فارسی کی عظیم روایت کو سنسکرت کی روایتِ شعری اور مقامی تاثرات سے ہم آہنگ کر کے مخصوص لب و لہجہ اختیار کیا جو اردو کا اپنا لہجہ ہے۔ اپنی پہچان ہے۔

درشن سنگھ اگرچہ فارسی کے بھی عالم ہیں، مگر انہوں نے اپنے شعری اظہار کے لیے اردو۔ اور بالخصوص اردو غزل کو ہی اپنے مزاج اور افتادِ طبع کے مطابق تصوّر کیا۔ اگرچہ اس سے قبل ان کی منظومات کا مجموعہ بھی منظرِ عام پر آچکا ہے جس میں بیانیہ شاعری کے خوبصورت نمونے ہیں، اور اجمال کے بجائے تفصیل سے کام لیا گیا ہے۔ مگر میرا خیال ہے کہ ان کی خلّاقانہ فطرت کے جوہر غزل کے رمزیہ اور اجمالی انداز میں ہی کھلتے ہیں۔ 'متاعِ نور'۔ ان کی غزلوں کا مجموعہ ہے۔ جس کا اسمِ اعظم ہے۔ عشق۔ کبھی کبھی ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان کی تمام تر شاعری اسی ایک لفظ۔ عشق۔ کی تفسیر ہے۔ یہ عشق انہیں زماں و مکاں کی سیر کراتا ہے، انہیں کسی کی خلوتِ خاص میں باریاب ہونے کا مژدہ سناتا ہے، انہیں عوام النّاس سے محبت کرنے کے لیے اکساتا ہے، ان کے دل

میں سوز و گداز پیدا کرتا ہے اور اس حقیقت سے پردہ اٹھاتا ہے کہ خالقِ کائنات ایک ہے۔ اور جب اس کی نظر میں کوئی کم تر اور برتر نہیں تو بندگانِ خدا میں تفریق کیوں ہو؟ سب انسان ایک عالمی برادری کے کنبے کے افراد ہیں۔ پھر رنگ و نسل، زبان و مذہب اور ملک و قوم کی دیواریں مصنوعی ہیں۔ ان دیواروں کا وجود نسلِ انسانی کی بقا کے لیے مضر ہے۔ رضائے خداوندی کے برعکس ہے۔ اور جب تک ان مصنوعی دیواروں کو، جو ملکوں اور قوموں نے ذاتی مفادات کی خاطر کھڑی کی ہیں، گرایا نہیں جائے گا، انسانیت موجودہ عالمی بحران سے نہیں نکل سکتی۔ یہ تاثرات درشن کی شاعری کے مطالعے سے ہی مرتب ہوئے ہیں۔ آئیے۔ کچھ دیر ان کی غزلوں کی دنیا میں چلیں ؎

خاک سے تا بہ کہکشاں ہم نے تو جب کیا سفر
عشق ملا قدم قدم، حُسن ملا نظر نظر

حُسن سے بھی سوا ہے کچھ عشق کی روشنی ہمیں
وہ ہے چراغِ انجمن، یہ ہے چراغِ رہ گزر

اپنے ہی دوست کی تو ہیں جتنی ہیں یہ نشانیاں
دیر ملے تو سر جھکا، کعبہ ملے، سلام کر

نام ہے آدمی تو کیا، اصل میں روحِ عشق ہوں
ساری زمیں ہے میرا گھر، سارا جہاں مرا وطن

پرتوِ عین ذات ہیں، روشنیاں صفات کی
اصل میں دونوں ایک ہیں شیخ ہوں یا ہوں برہمن

اہلِ دوئی کو عشق سے وحدتِ کیفیت ملی
بادہ کشوں میں بٹ گیا پیرِ مغاں کا پیرہن

حرم و دیر میں بٹ جاتے ہیں رندانِ وفا
حرم و دیر کی تفریق مٹا دے ساقی

کٹ گئی عمر محبت کے سفر میں لیکن
صبح کو شامِ تمنا سے گریزاں دیکھا

منزل کہاں خیال کی دیر و حرم کہاں
پہنچے تلاشِ یار میں اپنے قدم کہاں

عاشق کے دل میں دونوں جہاں آشکار ہیں
اس مرتبے کو پہنچا بھلا جامِ جم کہاں

یہ ہوس کے بندے ہیں ناصحا، نہ سمجھ سکے مرا مدعا
مجھے پیار ہے کسی اور سے، مرا دل رُبا کوئی اور ہے

یہ پیار کا جذبہ، یہ محبت کی سرشاری، یہ عشق کا والہانہ پن ۔ ورشن کی شاعری میں جاری وساری ہے۔ یہی عشق ہے جو انہیں منزل بہ منزل لیے پھرتا ہے یہی عشق ہے جو ان پر یہ حقیقت آشکار کرتا ہے کہ معبودِ حقیقی ایک ہے۔ مگر اس کے چاہنے والوں نے حرم ودیر کی تفریق پیدا کر کے دوئی کا رنگ پیدا کر دیا ہے۔ وہ ایک سچے عارف کی طرح دوئی کے پردے چاک کر دینا چاہتے ہیں اور تمام انسانوں اور خدا سے محبت کرنے والوں کو ایک مرکز پر دیکھنا چاہتے ہیں۔ انہیں 'عشق' کی وہ شمع دینا چاہتے ہیں جو ایک مقدس آتش کی طرح ان کے سینے میں جل رہی ہے اور جس کی روشنی سے یہ جہانِ معنی روشن اور منور ہے۔ وہ نہ کسی تذبذب کے شکار ہیں، نہ ذہنی خلفشار میں گرفتار ہیں۔ نہ اِدھر اُدھر بھٹکنے کے قائل ہیں۔ ان کے سامنے ایک منزلِ مقصود ہے۔ معرفت کی ایک راہ متعیّن ہے اور ان کے شعور و وجدان نے انہیں یکسوئی اور یقینِ کامل بخشا ہے کہ وہ ذاتِ واحد اور لاشریک ہے جس کی طرف ان کے قدم بڑھ رہے ہیں۔ انسان کی معراج یہی ہے کہ وہ اپنے معبود کو پہچان لے۔ صالح عمل کرتا رہے اور ایک ذرّہ نور کی طرح آخر کار اس 'منبع نور' سے جا ملے۔ یہی ان کی تعلیمات کا نچوڑ ہے، اور یہی ان کا مسلکِ حیات و نظریۂ شاعری ہے ؎

کوئی سالک ہے نہ مسلک بجز ایمائے سلوک
دل ہی کھینچے لیے جاتا ہے سرِ راہ گزار

مٹا کر مجھے آپ میں جذب کر لے
بقا کے لیے میں فنا چاہتا ہوں

تجھے کیا خبر مرے ہم سفر، مرا مرحلہ کوئی اور ہے
مجھے منزلوں سے گریز ہے، مرا راستہ کوئی اور ہے

نہاں ہیں تکمیل خود شناسی میں جلوہ ہائے خدا شناسی
جو اپنی ہستی سے بے خبر ہے وہ آپ سے آشنا کہاں ہے

اس شعر میں "تکمیل خود شناسی" کا ٹکڑا انسان کی عملی زندگی اور اس کی گوناگوں مصروفیتوں اور جد وجہد کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے اور درشن کے اس عظیم فلسفۂ حیات کو آشکار کرتا ہے کہ عشقِ خداوندی کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ انسان گوشہ نشین ہو جائے۔ ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ جائے اور دنیا سے کنارہ کش ہو جائے۔ بہ قول اقبالؒ

عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی
یہ خاکی اپنی فطرت سے نہ نوری ہے نہ ناری ہے

ترکِ دنیا کی تعلیم درشن کے منظریۂ حیات سے مطابقت نہیں رکھتی اور واقعہ یہ ہے کہ ایک گوشے میں بیٹھ کر ترکِ دنیا کرنا آسان ہے۔ مگر دنیا کے تمام ہنگاموں سے نبرد آزما ہوتے ہوتے اور عصری تقاضوں کے تحت جد وجہدِ حیات کرتے ہوئے خدا شناسی کو اپنا مطمع نظر بنائے رکھنا اور فرائضِ منصبی ادا کرتے ہوئے منزلِ معرفت کی طرف بڑھتے رہنا نسبتاً مشکل کام ہے اور اسی لیے یہ عمل خدا کو زیادہ مرغوب ہے۔ زندگی سب سے بڑی نعمت ہے جو خدا نے انسان کو دی ہے۔ اس لیے اس عطیۂ خداوندی پر ناز کرنا اور سجدۂ شکر ادا کرنا عین عبادت ہے۔

نفس نفس مجھے لازم ہے شکر کا سجدہ
کہ میرے دوست کا احساں ہے زندگی میری

کتنی طمانیت ہے درشن کے اس شعر میں۔ اور یہ کیفیت اس لیے ہے کہ ان کا عقیدہ پختہ ہے اور یقین راسخ۔ وہ ایک سچے مُوحِّد ہیں، اور راہِ معرفت کے رہرو۔ عشق ان کا رہنما ہے اور سوزِ دل ان کا ہم سفر۔ اُن کی نگاہ سے جلوۂ صد رنگ کا نظارہ کیجیے ؎

ہر ایک ذرّہ صحرا ہے آئینہ خانہ
ہجومِ جلوہ سے حیراں ہیں تیرے دیوانے

وہ سر کہ جس کو نہ سجدے سے تھی کوئی نسبت
نہ جانے کیوں ترے در پر وہ دیر سے خم ہے

ہوش والوں کو سراسیمہ و حیراں دیکھا
تیرے دیوانے کو ہر حال میں شاداں دیکھا

سب یہاں وحدتِ جلوہ کے پرستار ملے
تیری محفل میں نہ ہندو نہ مسلماں دیکھا

جزو سے کُل کی طرف جن کا سفر ہے روز و شب
موت ان کی منزلِ مقصود کا اک نام ہے

سرزمیں در سرزمیں میرے لیے اس کا جمال
آسماں در آسماں میرے لیے دیدارِ دوست

گوشے گوشے سے نمایاں ہو گئے انوارِ دوست
ذرّہ ذرّہ دے رہا ہے مژدۂ دیدارِ دوست

درشن دیدارِ دوست کو سرمایۂ جاں تصور کرتے ہیں، اس کی خوشنودی سے ایک نئی قوت کشید کرتے ہیں، غور کرتے ہیں کہ آخر خالق کائنات نے جو یہ زندگی پیدا کی ہے اس کو خوبصورت بنانا انسان کا فرض ہے اور اس فرض سے کوتاہی شاید رضائے خداوندی کے خلاف ہو۔ یہی احساس ہے جو انہیں زندگی کے ہنگاموں سے جوڑتا ہے اور اس منزل پر آکر ان کی شخصیت ایک مینارۂ نور بن جاتی ہے۔ اور ان کے اشعار لطیف شاعرانہ انداز میں درسِ حیات بن جاتے ہیں۔ اور ہزارہا بلکہ لاکھوں بندگانِ خدا ان کے دامنِ فیض سے منسلک ہو جاتے ہیں اور اپنے اپنے حالات اور نظریات کے مطابق کسبِ نور کرتے ہیں اور ان کے مسلک کو اپنی عام زندگی میں برتنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہاں ایک اور بات عرض کر دوں کہ درشن سنگھ نرے ناصحِ خشک نہیں ہیں۔ ان کے یہاں فنی محاسن کے ساتھ شوخیٔ بیان اور لطافتِ شعر بدرجۂ اتم موجود ہے۔ فارسی اور اردو کی شعری روایت کو بالخصوص انہوں نے اپنے مزاج و فکر میں جذب کیا ہے ـــ انسان بہتر سے بہتر کی جستجو میں خارزاروں

میدانوں، کوہستانوں اور وحشت خیز صحراؤں سے بھی گزرتا ہے اور زندگی کی جدوجہد میں جو نقشِ قدم چھوڑ جاتا ہے وہ آنے والی نسلوں کے لیے چراغِ راہ ثابت ہوتے ہیں. ایک دن وہ خود تاریخ بن جاتا ہے۔ مگر انسانی ذہن ایسے باعمل لوگوں کو تادیر یاد رکھتا ہے. اس موضوع کو ذہن میں رکھیے اور درشن کا ایک شعر سنیے جو جملہ شعری محاسن سے آراستہ ہے ؎

کتنے چمن کھلا گئیں آبلہ پائیاں مری
یاد رہے گا دشت کو میرے جنوں کا بانکپن

ایک اور شعر۔ موضوع زندگی اور عمل ہے. اور انداز بیان۔ نہایت شاعرانہ ؎

حیات کو دلِ سوزاں کی روشنی تو ملی
چمن کو گریۂ شبنم کی تازگی تو ملی

ایک اور خصوصیت جو درشن کے کلام میں جگہ جگہ نظر آتی ہے، وہ ارضیت ہے. انہیں کائنات کے اس کرۂ ارض سے محبت ہے جس پر وہ رہ رہے ہیں۔ جس پر انسانی معاشرہ موجود ہے۔ اور جس معاشرے کو بہتر بنانے کا خواب ان کی شاعری میں موجود ہے۔ وہ اس منزل پر کہ انسان اپنے ہی کرہ کے مسائل حل نہیں کر پایا ہے۔ یہ گوارا نہیں کرتے کہ وہ اپنے گھر کو افراط و تفریط کا شکار چھوڑ کر خلا میں سرگرداں پھرے. یہ احساس ان کے اشعار میں مختلف صورتوں میں جلوہ گر ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ یہ بنی نوعِ انسان سے ان کی شدید محبت کی دلیل ہے. چند اشعار ؎

دامِ رنگیں ہیں ترے واسطے یہ شمس و قمر
ان میں رہ جائے اُلجھ کر نہ کہیں تیری نظر

انساں زمیں کو دے نہ سکا آشتی کا نور
خود کو اگرچہ تا سرِ مہتاب لے گیا

ملا کیا چاند پر بھی جا کے مٹی کے سوا آخر
جنونِ شوق کی یہ چرخ پیمائی نہیں جاتی

چلا ہے آدمی تسخیرِ مہر و ماہ کی خاطر
مگر صیّاد ہی خود زیرِ دام آیا تو کیا ہوگا

ان اشعار سے اگر یہ نتیجہ اخذ کیا جائے کہ درشن انسان کی سائنسی ایجادات اور خلائی تسخیر کے خوابوں کی مخالف ہیں تو یہ غلطی ہوگی۔ ان کا ذہن جدید ہے۔ وہ سائنسی شعور رکھتے ہیں۔ اور اسی شعور کی بدولت وہ یہ چاہتے ہیں کہ سائنسی ایجادات اور تمام ترقیاں 'آشتی کا نور' پھیلانے کے لیے ہوں، امن کی فضا پیدا کرنے کے لیے ہوں انسان کا غم غلط کرنے کے لیے ہوں، انسانی زندگی کے مسائل حل کرنے کے لیے ہوں۔ یہ اعلیٰ درجے کی ایجادات اور کثیر الخرچ تجربات تخریب کے لیے نہ ہوں۔ اور اس منزل پر آکر ان کی آواز دنیا کے ان کروڑوں انسانوں کی آواز کو مزید قوت بخشتی ہے جو اس نکلیائی دور میں امنِ عالم کی جدوجہد کر رہے ہیں اور جو ایٹمی ہتھیاروں اور خلا میں نکلیائی جنگ کے خلاف ہیں۔ درشن انسانیت کے شاعر ہیں اور ان کا دل خون روتا ہے انسان کی زبوں حالی پر۔ انسان انسان کو قتل کرے! اپنا ہی ایک ہاتھ دوسرے ہاتھ کو قلم کرے! بھائی بھائی کا خون پیے! اس سے زیادہ بدقسمتی اور کیا ہوگی انسان کی!! کتنا درد ہے اُن کے اِن اشعار میں ؎

کہوں بھی کیا میں عزیزانِ دشمنِ جاں کو
مرا لہو ہے جو میرے لہو کا پیاسا ہے

اُٹھ رہا ہے اب زمانے سے محبت کا چلن
ہونے والا ہے جہانِ رنگ و بو زیر و زبر

کل بھی نوائے آگہی قیمتِ سنگ و خشت تھی
نغمۂ امن و آشتی جنسِ گراں ہے آج بھی

صحنِ گلشن میں لہو چھڑکا ہے دیوانوں نے
بوئے خوں آتی ہے اس فصل میں گلزاروں سے

آج انسانی سماج کا سب سے دردناک پہلو یہی ہے کہ محیّر العقول ترقیات اور ایجادات کے باوجود انسان کو سکون میسر نہیں۔ اس کے سر پہ ہر وقت موت اور غارت گری کی تلوار لٹکتی رہتی ہے۔ اس کا مداوا کیا ہے — ! صرف محبت — محبت کا چلن عام کرنے سے ہی بقائے انسانی کے امکانات روشن ہو سکتے ہیں۔ درشنؔ نہایت دھیمے لہجے اور غزل کی زبان میں ایکتا اور اتحاد کا درس دیتے ہیں اور صدیوں کی تشنگی بجھانے کا نسخہ تجویز کرتے ہیں ؎

بجھ جائے گی مل جل کے اگر پیاس بجھاؤ
گنگا ہی کے نزدیک تو ہے رودِ جمن بھی

شاعری کو علوم و فنون میں بہت بڑا درجہ دیا گیا ہے اور یہاں تک کہا گیا ہے کہ ؎

"شاعری جزویست از پیغمبری"

ایسی صورت میں شاعر کی حیثیت محض تماشائی کی نہیں ہو سکتی اسے معاشرے کی خدمت انجام دینی ہے۔ وہ امن کا پیامی ہے۔ انسانیت کی اعلیٰ قدروں کا ترجمان ہے۔ درشن نے شاعر کے اس فرض کو سمجھا ہے اور اپنے اشعار میں اپنے ہم جلیسوں اور ہم نفسوں سے بار بار خطاب کیا ہے ؎

غمِ انساں ہو عیاں آپ کے شہ پاروں سے
ہے گذارش یہ مری آج کے فنکاروں سے

حقیقتوں سے بہر حال جو گریز کرے
وہ شاعری ہے نہ حکمت، نہ وہ ہنر ہے نہ فن

نقش و نگارِ حرف و لفظ وجہِ کشش سہی مگر
خونِ جگر سے ہم نفس ہے یہ بہارِ فکر و فن

ان اشعار سے ان کے نظریۂ شاعری پر اور روشنی پڑتی ہے اور محسوس ہوتا ہے کہ وہ اپنے فن کے بارے میں کتنے سنجیدہ ہیں۔ ان کی شخصیت میں ایک بلند پایہ انسان اور ایک اعلیٰ درجے کے شاعر کا امتزاج نظر آتا ہے۔ انہوں نے اپنے اشعار کی آبیاری خونِ جگر سے کی ہے۔ اور نصف صدی کی مشقِ سخن اور فنی ریاضت نے ان کے

کلام کو معائب سے پاک اور محاسنِ شاعری سے مزین کر دیا ہے۔ غزل ان کی محبوب صنفِ سخن ہے جسے انہوں نے اپنے خونِ جگر سے جلا بخشی ہے۔ اسی لیے وہ نہیں چاہتے کہ اس نازک اندام پر سفاکانہ تنقید مشقِ تیغ زنی کرے ؎

اشعارِ غزل پر رکھ دینا تیشہ نہ کہیں تنقیدوں کا
شیشے سے بھی نازک ہوتے ہیں یہ سیم بدن اصنامِ غزل

دراصل اس شعر کے پردے میں انہوں نے عصری تنقید کے بارے میں اپنے گراں قدر خیالات کا اظہار کیا ہے اور بعض ناقدوں کے غیر ادبی رویے کی طرف اشارہ کیا ہے اور واقعہ یہ ہے کہ ابھی اردو تنقید کو بہت آگے جانا ہے اور اس کے سامنے علم و تجسس کے بہت سے میدان ہیں جن کو سر کرنا باقی ہے۔

بات سیم بدن اصنامِ غزل کی چلی ہے تو آیئے درشن کے کچھ ایسے اشعار سے بھی لطف اندوز ہوں جن میں زبان و بیان کا چٹخارہ ہے اور کلاسیکل غزل کی مخصوص فضا ہے ؎

تجھے جو پوچھنا ہے پوچھ لے اے داورِ محشر
میں اپنے ساتھ اپنی بے زبانی لے کے آیا ہوں

تو آ کے مرے گھر پہ مرے حال کو پوچھے
ایسی بھی تجھے کیا ستم ایجاد پڑی ہے

عشق کی بات غلط، حسن کی ہر بات حسیں
آپ سچ کہتے ہیں، ہاں آپ بجا کہتے ہیں

درشن نام ونمود اور شہرت کی طلب سے بہت دور ہیں۔ مشاعرے ان کا میدان نہیں، آج کل ادبی رسائل کی طرف بھی اپنی بے پناہ مصروفیات کے باعث توجہ نہیں کر پاتے۔ بحیثیت ایک روحانی رہنما کے وہ عالمگیر شہرت اور مقبولیت کے مالک ہیں ؎

"ایں سعادت بزورِ بازو نیست"

ان کا روحانی مِشن عالمگیر مقبولیت کا حامل ہے، جو ایک نہایت مربوط تنظیمی سانچے میں ڈھلا ہوا ہے۔ ان کے مِشن کی شاخیں دنیا کے ۳۸ ملکوں میں موجود ہیں اور تاحال ساڑھے پانچ سو مرکز ہیں جو دنیا کے اِس سرے سے اُس سرے تک پھیلے ہوئے ہیں۔ مہاراج درشن سنگھ کی اس مقبولیت کی وجہ ان کی روشن ضمیری اور انسان دوستی ہے۔ خود شناسی اور خدا شناسی ان کی تعلیمات کا نچوڑ ہے، اور انسانی مساوات اور عالمی بھائی چارے کی تعلیم ان کے ملفوظات سے عیاں ہے۔ مستحکم اور دائمی بنیادوں پر امنِ عالم کا قیام ان کی زندگی کا نصب العین ہے جو ان کی شاعری میں بھی جگہ جگہ عکس ریز ہے۔ مذاہبِ عالم کا تقابلی مطالعہ ان کا محبوب مشغلہ ہے اور دراصل اسی عمیق مطالعہ اور وحدہٗ لاشریک پر پختہ ایمان کی وجہ سے ان کے ہر لفظ میں ایک تاثیر موجود ہے۔ ان کے پیروکاروں میں ہر مذہب و ملت کے لوگ ہیں، ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی، بودھ، جین، پارسی — وہ بھی جو خدا کی ذات پر یقین رکھتے ہیں اور وہ بھی جو مادہ پرست ہیں۔ درشن کا پیغام سب کے لیے ہے اور سب کے دلوں کو مسخر کیے ہوئے ہے۔ انہوں نے اپنے اس شعر میں خود اپنا تجزیہ کیا ہے ؎

میں نے پی صہبائے عرفاں ہر تجلّی گاہ سے
ایک ہی ساقی تھا جو میخانہ در میخانہ تھا

ان کی تصنیفات و تالیفات کا ترجمہ دنیا کی تقریباً چالیس زبانوں میں ہو چکا ہے۔ تمام کلاسیکل زبانیں جیسے سنسکرت، عبرانی، عربی، فارسی، یونانی۔ اور مغرب کی بیشتر زبانیں جیسے انگریزی، جرمن، ہسپانوی، اطالوی، روسی، پرتگالی۔ مشرق کی اہم زبانیں۔ چینی، جاپانی، ہندوستان کی سبھی اہم زبانیں اور برّاعظم افریقہ کی زبانیں ان کے افکار و اشعار کے تراجم سے مزیّن ہو چکی ہیں اور عالمی ادب کے تناظر میں افہام و تفہیم کا سلسلہ جاری و ساری ہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ یہ ان کا ادب پر احسان ہے کہ انہوں نے گوناگوں مصروفیات کے باوجود غزلیات کا یہ مجموعہ مرتب کیا اور ایسی شاعری کا ایک اور مجموعہ اہلِ ذوق کے ہاتھوں میں آیا جس شاعری کی بابت کہا جا سکتا ہے کہ ؎

"شاعری جزویست از پیغمبری"

میری گذارش پر درشن سنگھ جی نے اپنے پہلے مجموعۂ کلام "تلاشِ نور" کی کچھ منتخب غزلیں بھی اس مجموعہ میں شامل کر لی ہیں اور اس طرح یہ مجموعۂ غزلیات "متاعِ نور" ان کی غزلوں کا نمائندہ مجموعہ بن گیا ہے۔

میں اس سعادت پر فخر محسوس کر رہا ہوں کہ مجھے ان کی غزلوں کے بارے میں اپنے منتشر خیالات پیش کرنے کا موقع نصیب ہوا۔ مجھے یقین ہے کہ علمی اور ادبی حلقوں میں "متاعِ نور" کا گرم جوشی سے استقبال کیا جائے گا اور تراجم کے ذریعے یہ غزلیں دنیا کی دوسری زبانوں تک پہنچیں گی اور اردو شاعری نئی وسعتوں سے

ہم کنار ہو گی۔ اپنی اس گفتگو کو میں درشن سنگھ کے ہی ایک مقطع کے ساتھ ختم کر رہا ہوں ؎

درشن یہ آرزو ہے کہ جب میرا ذکر ہو
قِصوں سے اہلِ دل کے مری داستاں ملے

رفعت سروش

دہلی ۔ ۲۹ مئی ۱۹۸۸ء

میرا نظریۂ شاعری

نقش و نگارِ حرف و لفظ وجہِ کشش سہی، مگر
خونِ جگر سے ہم نفس! ہے یہ بہارِ فکر و فن

میرا نظریۂ شاعری

میرا نظریۂ شاعری صرف ذہن کی یا فکر و مطالعہ کی اُپج نہیں۔ وہ میری زندگی سے پیدا ہے اور میری ذات و حیات تک ہی محدود نہیں، بلکہ ہمارے چاروں طرف انسانی زندگی کا جو بحرِ بیکراں موجزن ہے، اُس سے جڑا ہوا ہے۔

میری شاعری۔ جو میری روح کی پکار ہے، دو عظیم رہنمایانِ حقیقت میرے مرشدِ پاک حضور بابا ساون سنگھ جی مہاراج اور والدِ بزرگوار سنت کرپال سنگھ جی مہاراج کی نظرِ کرم کی دین ہے۔ میں نے ان لفظوں میں ان کا شکریہ ادا کرنے کی کوشش کی ہے:

نفس نفس مجھے لازم ہے شُکر کا سجدہ
کہ میرے دوست کا احساں ہے زندگی میری

میرا نظریۂ شاعری اگر دو لفظوں میں بیان کیا جا سکے تو اس کے لیے صرف "انسان دوستی" کا استعمال کافی ہوگا۔ یہاں میں یہ واضح کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ "انسان دوستی" سے میری مُراد کسی مروجہ ازم (ISM) یعنی مسلک یا نظریے سے نہیں، بلکہ اُس لافانی عنصر سے ہے جو انسان کے خمیر میں ہے، اور وہ بنیادی عنصر ہے محبت جو بنائے حیات اور تخلیقِ کائنات کا جوہر ہے۔ اس بات کو میں نے ایک شعر میں

یوں سمیٹا ہے:

محبت ابتدا و انتہا ہے ہر دو عالم کی
یہ نذرانہ متاعِ جاودانی لے کے آیا ہوں

یہ بات کچھ اور وضاحت چاہتی ہے جو اس مضمون میں آگے آئے گی.
یہاں اتنا ہی کہنا کافی ہوگا کہ "انسان دوستی" کے مروجہ نظریے کو تھوڑی اور وسعت دی جائے تو ساری کائناتِ آب و گِل اس میں سمٹ آتی ہے۔ "انسان دوستی" کے نظریے اور محرکاتِ عمل کی وضاحت کے سِلسلے میں اپنے چند شعر میں یہاں پیش کرنا چاہوں گا:

ملی وہ مے کہ میں سرشار ہو گیا ساقی
ہر آدمی سے مجھے پیار ہو گیا ساقی

گلے لگا لو ہر انسان کو کہ اپنا ہے۔
چلو تو راہ گزاروں میں بانٹتے ہوئے پیار

میں نے سیکھا ہے زمانے سے محبت کرنا
تیرا پیغامِ محبت مرے کام آیا ہے

اپنے ہی دوست کی تو ہیں جتنی ہیں یہ نشانیاں
دیر ملے تو سر جھکا، کعبہ ملے سلام کر

جوشِ مستی میں بغلگیر ہوں. بچھڑے ہوئے دل
آج انسان کو انسان بنا دے ساقی

نام ہے آدمی تو کیا، اصل میں روحِ عشق ہوں
ساری زمیں ہے میرا گھر، سارا جہاں میرا وطن

امن کی بات چلے، پیار کا پیغام چلے
بات جب چل ہی پڑی، صبح چلے شام چلے
چھا گئی وقت کے میخانے پہ ساون کی گھٹا
ساقیا! جام چلے، جام چلے، جام چلے

میرا خیال ہے کہ خلائے لامحدود میں معلّق ہمارا یہ کرۂ ارض اور اس میں رہنے والی مخلوق طبعاً معصوم اور بے گناہ ہے. خالقِ واحد نے، جو سب کا کرتا دھرتا اور پالن ہار ہے، اس کائنات کو بغیر کسی مقصد کے ارتجالاً خلق نہیں کیا. تخلیقِ کائنات کے پیچھے کوئی مقصد ہے جس کا ذکر دھرم گرنتھوں اور مذہبی صحیفوں میں موجود ہے. شاعر نے اُسے اس شعر میں یوں سمیٹا ہے ؎

دردِ دل کے واسطے پیدا کیا انسان کو
ورنہ طاعت کے لیے کچھ کم نہ تھے کرّوبیاں

خواجہ میر دردؔ کے اس شعر کے مرکزی خیال کو علامہ اقبالؔ نے اس شعر میں زیادہ موثر اور تابناک انداز میں پیش کیا ہے ؎

خدا کے بندے تو ہیں ہزاروں، بنوں میں پھرتے ہیں مارے مارے
میں اُس کا بندہ بنوں گا جس کو خدا کے بندوں سے پیار ہوگا

ایک خدا کی مخلوق ہونے کے ناطے ہم سب انسان ایک ہیں۔ ایکتا ہی ہمارے خمیر میں ہے، ہماری ذات میں ہے۔ انسان انسان سب ایک ہیں۔ روحانی رابطے کے ناطے، جذباتی ہم آہنگی اور بشری اشتراک اور میل جول کے ناطے۔ رنگ، نسل اور قومیت کے لحاظ سے مختلف جغرافیائی خطوں میں بٹے ہوئے انسان ماحول اور نیچر کے اثرات کی بنا پر تو الگ ہو سکتے ہیں لیکن رنج وغم، انبساط و نشاط، اخلاق و عبودیت اور انسانی نقطہ نظر سے منقسم نہیں ہو سکتے۔

میری دلی خواہش ہے کہ اس کرۂ ارض کے ہر متنفس کا احترام کیا جائے۔ اس کی ذاتی قابلیت، شرافت، برتری اور آدمی ہونے کا لحاظ رکھا جائے تاکہ ایک ایسی سازگار فضا تیار ہو جائے جس میں عشق ہو، محبت ہو، خلوص ہو، کردار ہو، ربط ہو، موافقت ہو، یگانگت ہو، رحم ہو، لطف ہو، عزت ہو، احترام ہو، امن ہو، شانتی ہو، اور روحانی خوشی کا دور دورہ ہو۔ انسان کا ہمیشہ یہی نصب العین رہا ہے کہ وہ ایسی سازگار فضا میں رہ کر عمل پیہم، یقینِ محکم اور جیو اور جینے دو کے بلند نظریات پر عامل رہے اور اس آخری منزل پر پہنچے جہاں روح کا خالق سے اتصال ہوتا ہے اور بالآخر اُسے نجاتِ ابدی حاصل ہوتی ہے۔

میرا یہ جذبہ بظاہر ناممکن العمل معلوم ہوگا لیکن اگر ہر آدمی اپنے طور پر اور سب لوگ مل کر اس جذبے کے ساتھ تکمیلِ ذات کی طرف آگے بڑھیں تو کام آسان ہو جائے گا اور ہمارا یہ کرۂ ارض، اپنی منزل و معراج کے قریب تر ہو جائیگا۔ یہ بات سن کر شاید کچھ ابروؤں پر شکن پڑ جائے، مگر میں خدا کے

وجود کو تسلیم کرتا ہوں اور کُل مخلوقِ عالم کو امانتِ خدا سمجھتا ہوں، جس میں خیانت کرنے کا کسی کو حق نہیں پہنچتا، گورا ہو یا کالا، ایشیائی ہو یا یوروپین، افریقی ہو یا امریکی، سب بہرحال انسان ہیں اور ہمیں انسان پر آنے والی ہر مصیبت کا مل کر ایک جٹ ہو کر مقابلہ کرنا چاہیئے۔ اس لیے نہیں کہ امریکی، روسی، یوروپین، افریقی یا ایشیائی بچ جائیں۔ بلکہ اس لیے کہ انسان محفوظ رہے، تا کہ ہم انسانیت کے آگے سُرخرو اور سربلند رہ سکیں۔

ہر ملک کو اپنی آزادی اور سالمیت کے حصول اور اُسے قائم و برقرار رکھنے کے لیے سعی تو کرنی چاہیئے، لیکن حبِّ قومی کے جوش میں اُسے دفاعی ایٹمی طاقت فراہم نہیں کرنی چاہیئے، کیونکہ یہ امن برائے جنگ ہے جو خوف و ہراس کو جنم دیتی ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ کوئی ملک اپنی حدود کی توسیع کے لیے دوسرے ملکوں کو آتشیں آلاتِ حرب کا شکار بنائے۔

میں آغوشِ تصوّف کا پروردہ ضرور ہوں، لیکن متصوّفانہ زندگی کو جامد و ساکن چیز نہیں سمجھتا۔ تصوّف تزکیۂ نفس اور طہارتِ فکر کی کاوش و ریاضت ہونے کے باوجود ایک ایسا جیتا جاگتا پیمانہ ہے جو شرابِ حیات سے لبریز ہے اور جس کی صہبائے سرمدی سے قوّتِ حیات اور تحریکِ ارتقا ملتی ہے۔ ہمارے پراچین رِشی مُنی، اور ان کے بعد آنے والے سادھو، سنت، مہاتما، ولی، صوفی اور فقیر ان ہی جذبات اور احساسات کو لے کر روحانیت کے راستے پر آگے بڑھے۔ یہ ایک غلط خیال ہے کہ ان عظیم رہنماؤں کی تعلیمات کا نچوڑ ترکِ دنیا ہے۔ ترکِ دنیا ایک بہت بڑا فلسفہ ہے جس کے گہرے مطالعے کے بعد یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ اُصولِ ترک ارتقائے انسانیت کا محرک ہے۔ کیونکہ ترک کا مطلب جہاں تک میں سمجھتا ہوں، منافرت کے اُن جذبات کا ترک ہے جن سے ما و من کی تخلیق ہوتی ہے اور

اس سے نفسانی مقاصد کے تصادمات پیدا ہوتے ہیں۔ تو کیا بُرا ہے کہ ان تصادمات کو ترک کر کے ہم ایک ایسی پُرخلوص اخوّت کا حلقہ بنائیں جس میں تمام افراد ایک دوسرے کی بہتری اور فروغ کی سعی کریں اور روئے زمین پر بسنے والا ہر بشر نجات وامن کی زندگی بسر کر سکے۔

میں POSITIVE MYSTICISM یعنی مثبت تصوّف پر یقین رکھتا ہوں۔ NEGATIVE MYSTICISM یعنی منفی تصوّف کو میں پسند نہیں کرتا۔ یہ بر خود غلط نظریۂ توکّل، قناعت اور زندگی سے فرار پر مبنی ہے۔ حقیقی تصوّف منزل کو پانے کے لیے مسلسل جہد و عمل کا جذبہ ہمارے اندر پیدا کرتا ہے۔ روحانیت یا تصوف کا مدار و محور اپنے آپ میں مکمل اور بھرپور ایک اکھنڈ (ناقابلِ تقسیم) پرم ستّا یا عظیم طاقت ہے اور یہ ساری کائنات، یہ ساری مخلوقِ عالم بھی ایک ناقابلِ تقسیم اکائی ہے۔ وہی ایک طاقت۔ اُسے پرماتما کہو، خدا کہو، GOD کہو، واہ گورو کہو سب کو بنانے والی ہے اور سب کو لیے کھڑی ہے۔ روحانی ترقی یعنی عرفانِ ذات وعرفانِ حق یا خود شناسی اور خدا شناسی کی وہ منزل جہاں انسان اپنے خدا سے اور اس کی بنائی ہوئی کل کائنات سے ایک ہو جاتا ہے۔ اس منزل پر جو لوگ پہنچے وہ نج آنند یا سرورِ ذات کے عالمِ محویت کی مستی اور سرشاری میں بے اختیار پکار اُٹھے:

"اہم برہم اسمی" یا "انا الحق" یا "ہمہ اوست"۔[1]

---

[1] ویدانتی مہاتما، جو اُس GREATER I-HOOD میں ہمہ گیر خودی میں جاگ اُٹھے، انہوں نے کہا "اہم برہم اسمی" کہ میں ہی برہم (خدا) ہوں اور اہلِ اسلام کے صوفیائے کرام جو اس منزل پر پہنچے انہوں نے اپنی زبان میں یہی بات کہی "انا الحق" کہ میں ہی حق یعنی خدا ہوں۔

میرے دونوں روحانی رہنما اور خدارسیدہ بزرگ عالمگیر محبت کے بنیادی اصول پر عامل تھے۔ اُن کے لفظوں میں: "خدا عشق ہے۔ روح اس کا جزو ہے۔ وہ ذاتِ حق عشق کا بحرِ بے کراں ہے تو انسان بحرِ بے کراں کی ایک لہر ہے۔ وہ کُل ہے تو یہ جزو۔ اور خدا کو ملنے کا راستہ بھی عشق ہے۔" وہ پریم کے بنیادی عنصر اہنسا یعنی جیو اور جینے دو کے اُصول کو زندگی اور عمل کا حصہ بنانے کی اُمنگ اپنی زندگی اور توجہ کے اُبھار سے لوگوں میں پیدا کرتے رہے۔ وہ عشقِ الٰہی، حبِّ خلق، انسانی بھائی چارہ اور ایکتا کے عالمگیر رہنما تھے۔

میری بہت بڑی خوش نصیبی تھی کہ ان دو پاک ہستیوں کا سایہ عاطفت مجھے نصیب ہوا۔ ان کی توجہ سے میں نے ایکتا اور وصالِ حق کی منزل کے بارے میں سیکھا اور سمجھا ہی نہیں، اُسے پانے کی مسلسل کوشش کر رہا ہوں۔ ان کی رہنمائی میں مختلف دھرموں اور مذہبوں کے پاک صحیفوں کا تقابلی مطالعہ اور موازنہ کرنے کے بعد میں اس نتیجے پر پہونچا ہوں کہ ایک ہی تعلیم ہے جو سب دھرموں اور مذہبوں کی بنیاد ہے اور یہی عالمگیر تعلیم موجودہ بے راہ روی اور دورِ حاضر کے تمام مسائل کا واحد حل ہے۔

شاعری۔ وہ کسی زبان میں ہو، طہارتِ فکر اور لطیف احساسات و جذبات کی چیز ہے۔ اس کی آمد اُس وقت ہوتی ہے جب روحانی ارتقا کی بلندیوں کو چھو لینے کی قدرتی خواہش تیز سے تیز تر ہوتی جاتی ہے۔

میں اس سلسلے میں یہ واضح کر دوں کہ اردو اور فارسی میں لفظ "ادب" (جس میں دوسروں کا احترام ملحوظ رکھا جائے) اور اس کے مترادف ہندی کے لفظ "ساہتیہ" (یعنی دوسروں کی بھلائی کے لیے بولا یا لکھا گیا لفظ)، یا انگریزی اور دوسری مغربی زبانوں میں LITERATURE یا اس کے مترادف الفاظ کے بھی یہی معنی نکلتے ہیں۔

یہ کلیان کاری ساہتیہ یا ادبِ عالیہ یا تو نظم میں یا پھر ایسی نثر میں جو نظم سے زیادہ قریب ہے ہم تک پہنچا ہے۔ جیسے وید کی رچنائیں، گیتا اور اُپنشدوں کے شلوک، شری گورو گرنتھ صاحب کی وانی، بائبل کے سام، قرآن شریف کی آیتیں وغیرہ۔

شعر و نغمہ کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ کلا یا فن۔ موسیقی ہو، شاعری ہو، مصوری ہو، نقاشی ہو یا رقص۔ خُدا کی دین ہے۔ فنونِ لطیفہ کا جنم خدا کی حمد و ثنا کے لیے، پربھو کے گن گان کے لیے ہوا تھا۔ لیکن وقت کے ساتھ ان کی اصل صورت بدل گئی۔ فنون لطیفہ میں سب سے اونچا درجہ سنگیت کو اور اس کے بعد دوسرا درجہ شاعری کو دیا گیا ہے۔ لیکن شاعری میں سنگیت کے دو اہم جز و سُر، اور لے یا تال آگے ہی سے موجود ہیں۔ شاعری خدا کی دین اور روح کا سنگیت یا نغمہ ہے۔ میں نے ایک بند میں اس خیال کو یوں ادا کیا ہے ؎

وہی ہے ساز کے پردے میں، لحن میں، لے میں
اُسی کی ذات کی پرچھائیاں ہر اک شے میں
نہ موج ہے نہ ستاروں کی آب ہے کوئی
تجلیوں کے اُدھر آفتاب ہے کوئی

اس کا یہ مطلب نہیں کہ عظیم شاعری صرف سنتوں، مہاتماؤں اور صوفی فقیروں نے ہی کہی ہے۔ کہنا صرف یہ ہے کہ یک سوئی اور محویتِ ذات کے لمحوں میں جب انسان۔ کوئی بھی انسان قائم بالذات یعنی اپنی روح یا آتما سے ہم آہنگ ہوتا ہے تو وہ شعر کہتا نہیں، شعر اُس پر اُترتے ہیں، نازل ہوتے ہیں۔ غالب نے اس کیفیت کو اپنے ایک شعر میں یوں بیان کیا ہے ؎

آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں
غالبؔ صریرِ خامہ نوائے سروش ہے

غیب سے مضامین خیال میں آنے کا مسئلہ برائے بیت نہیں ہے، بلکہ امرِ واقعہ یہ ہے کہ جب شاعر کے ضمیر کا آئینہ ایسا شفاف ہو جاتا ہے کہ اس کو اس عالم میں دوئی کے پردے ہٹتے نظر آتے ہیں تو وہی کیفیت ہوتی ہے جب مضامین اور اشعار کا نزول ہوتا ہے۔ اور ان کیفیات سے دل ہم آہنگ ہوتا ہے۔ زندگی اور اس کے متعلقات کی تمام کیفیتیں اور واردات دل کی طرف مرکوز ہوتی ہیں۔

دل جو انسان کے تمام تر تجربات اور سانحوں، کامیابیوں، مرادوں، اور نامرادیوں کا مرکز ہوتا ہے۔ نت نئی کیفیات سے متاثر ہوتا رہتا ہے۔ اور ایک لمحہ وہ آتا ہے جب انسان پر خلّاقانہ کیفیت طاری ہوتی ہے، اور اس کا تخلیقی عمل شروع ہوتا ہے۔ شاعر کے لیے یہی تخلیقی عمل نزولِ اشعار کی صورت میں ظہور پذیر ہوتا ہے اور اس تخلیقی عمل میں شاعر خارجی زندگی کے اثرات کو بھی اپنی ذاتی اور تجرباتی زندگی کا جزو بنا لیتا ہے ــ اور شعر ذاتی وارداتِ قلب کا آئینہ بن کر اپنا لفظی پیکر اختیار کرتا ہے۔ میری تمام تر شاعری اسی تخلیقی عمل کا بے باکانہ اور جذباتی اظہار ہے۔ میں اُسی وقت شعر کہتا ہوں جب محرکاتِ شاعری شعر کہنے کے لیے آمادہ کرتے ہیں۔ گویا میں شاعری میں آورد کا نہیں، آمد کا قائل ہوں۔ آورد کے لیے انسان طرح طرح کی کیفیات اپنے اوپر مسلّط کرنے کی کوشِش کرتا ہے۔ اور مصنوعی طور پر شعر کہنے کے اس عمل میں بعض مرتبہ وہ ایسی ایسی حرکتوں کا مرتکب ہوتا ہے جو شعر کی روح کو تو مجروح کرتی ہی ہیں، خود انسان کے ضمیر کو بھی ملامت کرتی ہیں۔ شعر گوئی کی کیفیت پیدا کرنے کے لیے نبتِ عنب کا سہارا لینا بھی بعض شعرا کا طریقۂ کار رہا ہے۔ میں نے بعض شاعروں کو یہ کہتے سنا ہے کہ شراب کے بغیر شاعری ہو ہی نہیں سکتی۔ شاعری اور شراب کو لازم و ملزوم قرار

دینے والے میرے نزدیک وہی ہو سکتے ہیں جن کا آئینہ قلب شفاف نہیں، اور جو اپنے آپ پر وجدانی کیفیت مسلط کرنا چاہتے ہیں۔ مجھے اس امر کا اعتراف کرنے میں ایک گونہ طمانیت اور فخر کا احساس ہے کہ بحیثیت شاعر میری تخلیقی سرگرمیاں نصف صدی پر محیط ہیں۔ مگر میں نے کبھی شراب نہیں پی، اور نہ کھانے پینے کی عادات اور شعر گوئی میں کوئی ربطِ باہمی محسوس کیا۔ میں نہ صرف یہ کہ مے نوش نہیں ہوں، بلکہ قطعاً VEGETARIAN ہوں۔ سادہ زندگی گزارتا ہوں۔ زندگی کے گرم و سرد سے شرابِ شعر کشید کرتا ہوں، جس کا نشہ وقت کے ساتھ بڑھتا جاتا ہے۔

مضمون کو اور طول نہ دے کر شعر کے CONTENT یعنی موضوع و مواد اور اُسکی FORM یعنی ہیئت اور اسلوب کے بارے میں چند لفظ کہنا چاہوں گا۔ تو پہلے موادِ موضوعِ سخن یا خیال پر غور کر لیا جائے۔ شاعری روح کی پکار ہے۔ اور اس بیان پر یہ قول صادق آتا ہے:

"OUT OF THE ABUNDANCE OF HEART A MAN SPEAKS."

انسان کے اندر اُس کے دل اور روح کے خزینۂ شعور و احساس میں جذبات و تاثرات کا ایک بحرِ بے کراں موجزن ہے۔ جو لفظ زبان سے نکلتا ہے، اس میں ڈوب کر نکلتا ہے اور وہی رنگ اور اثر اپنے اندر پیوست کر کے نکلتا ہے۔

روح کے خزینۂ احساس و شعور میں جذبات و تاثرات کا بحرِ بے کراں جو میری شاعری کا منبع ہے، میرے دور رہنمایانِ حق اور ان سے پہلے جتنے بھی ہادیانِ حق روشنی کی دولت لے کر دنیا میں آئے، اُن سب کے نور سے روشن ہے۔ ان کے کرم سے میرے تن من کا ساز لطیف سے لطیف تر ہوتا چلا گیا۔ لیکن اس سے نکلنے والا نغمۂ سخن، جوان کا ہے میرا نہیں لطیف تر ہے۔ اس بات کو میں نے اپنے ایک شعر میں یوں بیان کیا ہے ؂

دل سے نکل کے یہ صدا کیوں نہ دلوں میں ڈوب جائے
سازِ مرا لطیف ہے، نغمہ ترا لطیف تر

جیسا کہ میں نے اوپر کہا، میں نے ہر تجلّی گاہ سے کسبِ نور کیا ہے۔ جہاں بھی روشنی دکھائی دی، وہاں وہاں میں گیا۔ اس سلسلہ میں میرا ایک شعر ہے ؎

میں نے پی صہبائے عرفاں ہر تجلّی گاہ سے
ایک ہی ساقی تھا جو میخانہ درمیخانہ تھا

میں یہ مانتا ہوں کہ زندگی کے داخلی اور خارجی محرکات و مشاہدات کو بھرپور خلوص اور ایسے دلنشیں انداز میں پیش کرنا چاہیے کہ اس سے انسانی سماج کو اور نوعِ بشر کو ایک ایسا انبساط حاصل ہو جو اُسے متحرک کر سکے اور اسے جمود کی گھٹن سے نکال کر ایک ایسی تابندہ منزل کی طرف سرگرمِ سفر کر سکے جسے ہم منزلِ محبت یا منزلِ نور کہہ سکتے ہیں۔ میرے اس نظریے کو فروغ اُس وقت ملتا ہے جب ہم انسانی برادری کی وحدت کے لیے روحانی پلیٹ فارم بھی فراہم کر دیتے ہیں۔ یہ متحرک اور جیتا جاگتا روحانی منبع انسانوں کو ایک ایسی سپریم پاور SUPREME POWER (قوتِ مطلقہ) کی طرف لے جاتا ہے، جہاں سب متحد ہو کر سربسجود نظر آتے ہیں۔

ایک مافوق الفطرت سمت کا یقین کاروانِ بشر کو متحد ضرور کرتا ہے۔ اس لیے ہم تقریروں، تحریروں اور نثر و نظم کے ذریعے کوشاں رہیں کہ یہ روحانی سمت کا افق قدم قدم روشن اور اُجاگر ہوتا چلا جائے۔

جدید جوہریاتی دور میں ایک بالکل متحرک اور جاندار روحانیت کو پیش کرنے کا زرّیں موقع حاصل ہے۔ مذہب اور سائنس کا ٹکراؤ اسی زندہ و پائندہ مذہبیت کے فقدان کے باعث ہوتا ہے۔ میرا پختہ عقیدہ ہے کہ اگر روحانیت کی زندہ جاوید سیرتوں

پر عمل کیا جائے تو اس کرۂ ارض کو امن نصیب ہو سکتا ہے۔

میں نے اپنے پہلے شعری مجموعے کا نام "تلاشِ نور" رکھا تھا جس میں تصوف کے رنگ میں اردو اور فارسی کی غزلوں کے علاوہ تقریباً تمام بانیان مذاہب و ہادیانِ حق کی روح پرور تعلیمات کو ان کی زندگی اور شخصیت کے پس منظر میں نظموں میں فرداً فرداً پیش کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔ ان تمام ہستیوں کے سوانح حیات اور تعلیمات کا گہرا اور بھرپور مطالعہ کرنے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا کہ وہ سب اس بات پر اتفاق کرتے ہیں کہ خالقِ کائنات، منزلِ نور ہے۔ اُس کا پیغام لے کر آنے والے سنت، مہاتما، ولی، نبی اُس نورِ حق کے مظہر ہوتے ہیں جو انسان کی روح کو "منزلِ نور" یعنی ذاتِ حق میں واصل کر دیتے ہیں۔ سری گورو نانک دیو جی سب پیغمبروں، سنتوں، مہاتماؤں کی طرح اُسی ازلی اور ابدی نور کا پیغام لے کر آئے تھے اور ان کا مقصد طلب گارانِ حق کو "منزل نور" تک پہنچانا یعنی ذاتِ حق میں واصل کر کے نجاتِ ابدی دلانا تھا۔ اپنے دوسرے مجموعے کا نام میں نے "منزل نور" رکھا ہے۔ یہ ایک طویل مسدس ہے۔ جس میں سری گورو نانک دیو جی مہاراج کی کل وقتی اور عالمگیر تعلیم کو پیش کیا گیا ہے، جو فقرائے کامل اور بانیانِ مذاہب کی مشترکہ تعلیم ہے جس کا منتہائے مقصود روح کی "منزل نور" تک رسائی ہے۔

میرا یقینِ محکم، جو ذاتی تجربہ پر مبنی ہے، یہ ہے کہ ہم ناموں، شکلوں، بناوٹوں اور سماجوں کے باہری رسم و رواج کے بھید بھاؤ اور اختلافات سے اوپر اٹھ کر دھرم اور مذہب کی بنیادی حقیقتوں کو جن پر سارے دھرم اور مذہب کھڑے ہیں، زندگی اور عمل میں اپنائیں تو دنیا کو حقیقی خوشی نصیب ہو اور اسی میں نوعِ بشر کی بھلائی اور نجات ہے۔ "منزلِ نور" کی طویل نظم کے ایک بند میں میں نے سری گورو نانک دیو جی اور ان سے پہلے اور ان کے بعد آنے والے ہادیانِ حق کے حوالے سے صلائے عام

اور دعوتِ عمل دی ہے۔ دوسروں کو نہیں خود اپنے آپ کو بھی۔ میرا ایک بند ہے:

ہزار نام ہیں، ہر نام سے پکار اُسے
بُلا کے انجمنِ فکر میں سنوار اُسے
بٹھا کے جلوہ گہہِ قلب میں نکھار اُسے
لہو میں کر دے رواں، روح میں اُتار اُسے

ملے گا روح کو پرواز دے کے دیکھ ذرا
قریب ہے اُسے آواز دے کے دیکھ ذرا

میری شاعری کا مرکزی نقطہ ہمارے شاستروں کا یہ عرفان ہے۔ "وسودھیو کٹمبکم" جس کے معنی ہیں، یہ ساری مخلوقِ عالم ایک خدا کا کنبہ ہے، ایک پریوار ہے ایشور کا۔ شیخ سعدی نے اس حقیقت کو اس طرح بیان کیا ہے:

بنی آدم اعضائے یک دیگر اند
کہ در آفرینش زیک جوہر اند
چو عضوے بدرد آورد روزگار
دگر عضوہا را نماند قرار

رُوئے زمین پر بسنے والے تمام انسان ایک جسم کے مختلف اعضا کی طرح آپس میں جڑے ہوئے ہیں۔ ایک ہی جوہر سے وہ پیدا ہوئے ہیں۔ اگر ایک عضو میں درد اُٹھے تو تمام اعضائے جسم اُس درد کو محسوس کرتے ہیں۔ میری شاعری کا مرکزی نقطہ یا خیال قومی اور بین الاقوامی میل ملاپ اور ایکتا، سرب دھرم سم بھاؤ" یعنی

تمام مذاہبِ عالم اور بانیان مذاہب کے لیے ایک جیسی عقیدت اور احترام، اخلاق، امنِ عالم، عبودیت اور روحانیت ہے۔ شعر کہتے وقت میں ایسا محسوس کرتا ہوں جیسے میں مہاتما بدھ، سمراٹ اشوک، گورونانک صاحب، کبیر صاحب اور حضرت معین الدین چشتی کی زبان میں بات کر رہا ہوں اور انہیں کے جذبات کو پیش کر رہا ہوں۔

موضوعِ سخن پر کھل کر بحث کرنے کے بعد اب ذرا شاعری کی FORM یعنی ہیئت اور اسلوب پر بھی غور کر لیا جائے کہ اس کے بغیر بات ادھوری رہ جائے گی۔ یہ دونوں لوازماتِ سخن۔ موضوع کا انتخاب اور اندازِ بیان ایک دوسرے کی تکمیل کرتے ہیں اور تخلیقِ شعر کے لیے بہت اہمیت رکھتے ہیں۔ کتنی بھی اونچی بات ہو اس کا اثر اندازِ بیان پر منحصر ہے۔

میری شعر گوئی کا سلسلہ ۱۹۳۸ء سے شروع ہوا۔ ۱۹۳۷ء میں، میں نے میٹرک کا امتحان پاس کر کے گورنمنٹ کالج لاہور میں نیا نیا داخلہ لیا تھا، تو میرے مارکس (نمبر) اتنے اچھے تھے کہ میں انجینئرنگ یا میڈیکل لائن ہی نہیں، ٹیکنیکل تعلیم کے کسی بھی اچھے کالج میں داخلہ لے سکتا تھا۔ اس بارے میں کوئی فیصلہ کرنے سے پہلے والدِ بزرگوار حضورِ پُرنور سنت کرپال سنگھ جی مہاراج مجھے اپنے ساتھ اپنے مرشدِ اعظم سری حضور بابا ساون سنگھ جی مہاراج کے پائے اقدس میں ڈیرہ بیاس لے گئے۔ وہاں اچھے نمبروں سے میرے پاس ہونے کی خبر دینے کے بعد انہوں نے حضور مہاراج کی خدمت میں گذارش کی کہ آگے کالج میں اِسے کیا مضمون لینے چاہئیں؟ حضور مہاراج جی نے مجھے مبارکباد دیتے ہوئے بڑے پیار سے میری پیٹھ تھپتھپائی اور فرمایا: "لے کاکا! فارسی بڑی میٹھی زبان ہے تصوف کی بیشتر تعلیم اسی زبان میں ہے اس لیے اسے ضرور پڑھنا چاہیے۔" میں اپنی پسند کے بارے میں

لے کاکا پنجابی میں پیارے بچوں کو کہتے ہیں۔

کچھ کہنے والا تھا کہ والدِ بزرگوار نے اشارے مجھے روک دیا۔ دوسرے مضمون حضور مہاراج جی نے تواریخ اور انگلش لٹریچر تجویز کیے۔ مرشدِ اعظم کے اس فرمان کا نتیجہ تھا کہ میں جو اس وقت ڈاکٹر یا انجینئر بننے کی بات سوچ رہا تھا، ARTS یعنی ادب کے میدان میں چلا گیا۔ اردو فارسی کالج میں میرے پڑھائی کے مضمون تھے، اور میں، جسے شروع سے ادب میں دلچسپی تھی، شعر کہنے لگا۔ میرے اس شوق کو میرے اردو اور فارسی کے استاد صوفی غلام مصطفیٰ تبسم صاحب نے بڑھاوا دیا جو اردو اور فارسی کے بہت بڑے عالم ہونے کے ساتھ ساتھ دونوں زبانوں کے بہت بڑے ادیب اور شاعر تھے۔ میرے دوسرے رہنمائے شعروادب، انگریزی کے مشہور ادیب اور شاعر پروفیسر ایرک ڈکنسن صاحب تھے جو ہمارے کالج کے انگلش ڈپارٹمنٹ کے ہیڈ تھے۔ صوفی صاحب سے میں نے اردو فارسی کا فنِ عروض سیکھا اور پروفیسر ڈکنسن صاحب سے انگریزی شاعری کی PROSODY یعنی اوزان و بحور کا علم حاصل کیا اور میں نے انگریزی میں بھی شعر کہنا شروع کر دیا۔

۱۹۴۷ء کے بعد دلی میں ہندوستان کے اردو فارسی کے نامور ادیب اور شاعر حضرت شمیم کرہانی صاحب کی ہدایت اور رہنمائی میں مشقِ سخن کا موقع مجھے نصیب ہوا۔ میں اپنے برادرِ مشفق عالی جناب علی جواد زیدی صاحب اور رفیقِ دیرینہ عالی جناب رفعت سروش صاحب کا بھی مرہونِ منت ہوں کہ وہ اکثر و بیشتر مجھے اپنے قیمتی مشوروں سے نوازتے رہتے ہیں۔ یہ میری خوش نصیبی ہے کہ روحانیت کی طرح شاعری کے میدان میں بھی مجھے کامل استاد ملے۔ میرے استادوں کا یہ فرمان ہمیشہ میرے سامنے رہا کہ شعر میں یا تو کوئی نئی بات ہونی چاہیے یا اندازِ بیان نیا ہونا چاہیئے۔

میری شعر گوئی کو آج لگ بھگ پچاس برس پورے ہونے کو آتے ہیں۔ لاہور میں شعر گوئی کے ابتدائی دور میں اپنے کالج کے ماہنامہ "راوی" میں جو ان دنوں ایک بلند پایہ ادبی رسالہ سمجھا جاتا تھا، میری غزلیں شائع ہوئیں۔ بعد میں ریڈیو سے بھی میری نظمیں

اور غزلیں نشر ہونے لگیں۔ اردو فارسی کے علاوہ انگریزی میں بھی میں نے شعر گوئی کی ہے۔ انگریزی میں میری نظموں کے دو مجموعے۔ "CRY OF THE SOUL" (روح کی پکار) اور — A TEAR & A STAR (ایک آنسو، ایک ستارہ) چھپ چکے ہیں۔ میں نے ہندی اور پنجابی میں بھی شعر گوئی کی ہے۔ میں نے ہر موضوع اور ہر صنفِ سخن میں شعر کہے ہیں۔ اردو میں غزل، نظم، رباعی، قطعہ، مثنوی، مسدّس اور طرزِ جدید میں سانیٹ، بلینک ورس، فری ورس یعنی آزاد نظم یا نظمِ معرّا اور فارسی میں غزلیں اور رباعیاں میں نے کہی ہیں۔ میں ہر صنفِ سخن کو شاعر کے فکر کی جولانگاہ تصور کرتا ہوں اور محسوس کرتا ہوں کہ شاعر اصنافِ سخن کا اسیر نہیں ہوتا۔ وہ تو اس امر پر بھی قادر ہوتا ہے کہ جب چاہے مروجہ اصناف کے علاوہ نئی اصناف کا اختراع کرے اور اپنے اظہار کے لیے نئے اوزان، نئی بحریں اور نئے FORMS اختیار کرے مگر اس اجتہاد کا حق ہر شخص کو نہیں۔ صرف شاعر کو ہے ــــ قادر الکلام شاعر کو۔

روحانیت جو میری زندگی کا جزوِ لاینفک یا اٹوٹ انگ ہے اُسے موضوعِ سخن بنانے سے پہلے میں مروجہ روایتی انداز میں شاعری کرتا تھا۔ میرا رنگِ سخن رومانی یعنی تخیل پسند تھا۔ میرے موضوعاتِ سخن میں حب الوطنی، مظاہرِ قدرت اور انسان دوستی کے گوناگوں رنگ جھلکتے نظر آتے ہیں۔ میں نے اپنے ملک کے بدلتے موسموں کی بہاروں، میلوں ٹھیلوں، تیوہاروں، محبانِ وطن اور ملک کی آن پر مر مٹنے والے شہیدوں، بانیانِ مذاہب اور ہادیانِ حق پر جو نور کا پیغام لے کر دنیا میں آئے مختلف بحروں میں نظمیں کہی ہیں۔ میرے دو شعری مجموعے "تلاشِ نور" اور "منزلِ نور" چھپ چکے ہیں لیکن بہت سا نیا اور پرانا کلام طباعت کے لیے باقی پڑا ہے۔ جس سے تین نئے شعری مجموعے اشاعت کے لیے مرتب کیے جا رہے ہیں۔ ان نئے مجموعوں میں شامل کی جانے والی غزلوں اور نظموں کا انتخاب کیا جا چکا ہے۔ رومانی رنگ کے ابتدائی کلام کے علاوہ ایک

بہت بڑا ذخیرہ انسانی بھائی چارے اور امنِ عالم پر کہی گئی نظموں اور غزلوں کا شامل کیا جا رہا ہے۔

میری شاعری کا رُخ کب اور کیسے روحانیت کی طرف مڑ گیا۔ اس کے پیچھے ایک دلچسپ واقعہ ہے۔ میرے والدِ بزرگوار نے کالج کے ماہنامہ "راوی" میں چھپی میری ایک غزل پڑھنے کے بعد فرمایا: "درشنی! تم اچھی خاصی شاعری کر لیتے ہو۔ کیا اچھا ہو کہ اپنے مرشدِ اعظم کے جشنِ ولادت کی مبارک تقریب پر ایک غزل کہہ دو۔" میں نے عرض کیا۔ "شاعری تو میں کیا کروں گا، تھوڑی تک بندی ضرور کر لیتا ہوں۔" انہوں نے غزل کے لیے یہ مصرعہ طرح مجھے دیا۔ "خدا کا نور مرشد میں بھلا معلوم ہوتا ہے۔" اور فرمایا کہ اس مصرعہ پر ایک غزل کہو۔ یہ ۱۹۴۵ء کی بات ہے۔ وہ میری پہلی غزل تھی جو مروجہ رنگ سے ہٹ کر خالص روحانیت کے رنگ میں کہی گئی تھی۔ وہ غزل اتنی کامیاب ہوئی کہ خود مرشدِ اعظم نے اس کی داد دی۔ اس کے بعد میری روحانی شاعری کا سلسلہ دھیرے دھیرے آگے بڑھتا رہا اور جاری ہے۔

شاعری تہذیبِ فکر، تنشیطِ روح، شگفتگیٔ معاشرہ اور سرزمینِ عالم پر بسنے والی مخلوق کے دُکھ درد کا وہ بیان ہے جو معاشرے میں سچائی اور روئے زمین پر یگانگی کے جذبات کو فروغ دیتا ہے۔ میں انہی جذبات و خیالات کو بادہ و ساغر کے پیرایے میں پیش کرنے کی کوشش کرتا رہتا ہوں۔ کوشش ناکام ہو یا کامیاب مجھے اس کی فکر نہیں۔ لیکن سعی سے باز آنا میرے نزدیک جُرم ہے۔ اس سلسلے میں میں یہ بھی عرض کرنا چاہتا ہوں کہ مجھے مشیّت کی طرف سے ایک ایسا دل دے دیا گیا ہے جس سے انسانیت کی مظلومی دیکھی نہیں جاتی اور میں تڑپ اُٹھتا ہوں۔ میری تمام نظموں اور غزلوں کی تخلیق اسی جذبے کے تحت ہوئی ہے۔

میری رائے میں شاعری بہ اعتبار ہیئت اور اسلوب STATIC یعنی منجمد

چیز نہیں۔ بلکہ DYNAMIC یعنی متحرک چیز ہے اور وقت کے ساتھ ساتھ اس کا ارتقا ہوتا رہتا ہے۔ مگر اس سلسلہ میں میں متشدّدانہ تجربات کے حق میں نہیں ہوں۔ درحقیقت میں ہر قسم کے تشدّد کا، وہ ادبی تشدّد ہی کیوں نہ ہو، مخالف ہوں۔ ہمارے ادب نے صدیوں کے سنجیدہ تجربات اور تخلیقی جدوجہد سے جو کچھ ورثے میں پایا ہے۔ اُسے ضائع نہیں ہونے دینا چاہیئے۔ میں صاف، شستہ، نکھری ہوئی لطیف غزلوں کے حق میں ہوں، جن سے عوام کے ذہن لطف اندوز ہو سکیں اور جن کی افادیت محض شیش محل میں رہنے والوں تک ہی محدود نہ رہے۔ ندرت اور جدیدیت کے نام پر شاعری کی FORM یعنی ہیئت اور اسلوب اور اُس کے STRUCTURE یعنی ساخت کو زور زبردستی سے بدلنے کی میرے خیال میں کوئی ضرورت بھی نہیں۔ فیضؔ اور اقبالؔ کے نام اِس سلسلہ میں لیے جا سکتے ہیں جنھوں نے شاعری کی روایتی حدود اور قیود میں رہ کر اور مروجہ قواعد سے روگردانی کیے بغیر بڑی سے بڑی بات کہنے اور پیچیدہ سے پیچیدہ مضمون کو ادا کرنے میں پوری کامیابی حاصل کر لی ہے۔ خود مجھے اپنی شاعری میں روایتی حدوں اور پابندیوں میں رہ کر اپنی بات کہنے میں کبھی کوئی دقت پیش نہیں آئی۔

میرے والدِ محترم نے اپنے مرشدِ پاک کے ارشادات کو عملی جامہ پہنانے کے لیے سب سے پہلے روحانی ست سنگ کے نام سے ایک بین الملکی اور بین المذہبی مدرسۂ روحانیت اور اس کے بعد وشو دھرم سنگھ یعنی مذاہب کی عالمی انجمن —— (WORLD FELLOWSHIP OF RELIGIONS) اور وشو مانو ایکتا سمیلن — یعنی انسانی ایکتا کی انجمن (THE WORLD UNITY OF MAN SOCIETY) کے مشترکہ پلیٹ فارم یا سانجھے منچ قائم کیے۔

وشو دھرم سنگھ کے زیرِ اہتمام جتنے بھی عالمی اجتماع ہوئے وہ سب مذہبی

اجتماع تھے۔ ۱۹۷۴ء میں میرے والد بزرگوار نے دلّی میں انسانی ایکتا کی عالمی کانفرنس کا انعقاد کیا اور مذہب کی جگہ انسان کو اس کانفرنس کے لیے اکائی تسلیم کیا۔ تاکہ مومن اور کافر یعنی خدا کو ماننے اور نہ ماننے والے، آستک اور ناستک دونوں اس سمیلن میں شریک ہو سکیں۔ کیونکہ ایک ہی حقیقت دونوں میں کام کر رہی ہے۔ جیسا کہ ایک صوفی شاعر نے کہا ہے:

یک حقیقت جلوہ گر در کُفر و اسلام است و بس
اختلافاتِ مذاہب جملہ اوہام است و بس

ساون کرپال مشن دنیا بھر میں واحد روحانی پلیٹ فارم ہے جہاں ہر مذہب و ملت اور مدرسۂ خیال کے لوگ، وہ کسی بھی ملک اور طبقہ سے تعلق رکھتے ہوں پریم پیار سے اکٹھے بیٹھتے ہیں اور روحانیت کی عملی تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ اس مشن میں ہندو، سکھ، مسلمان، عیسائی، بودھ، جین، پارسی، یہودی اور باقی دھرموں کے لوگ شامل ہیں۔ اس آزاد روحانی مکتب یا یونیورسٹی کا داخلہ ہر شخص کے لیے کھلا ہے۔ ہر شخص اپنے اپنے سماج میں رہ کر، اپنے اپنے رسم و رواج اور طرزِ تخاطب رکھتے ہوئے صراطِ مستقیم پر گامزن ہوتا ہے۔ اس مشن کے اِس وقت پانچ سو سے اوپر سینٹر دنیا کے ۳۶ ملکوں میں قائم ہو چکے ہیں جن میں سے تقریباً دو سو ہندوستان میں ہیں۔

دنیا کے باقی اداروں میں انجینئر، ڈاکٹر، سائنسداں وغیرہ بنائے جاتے ہیں، مگر یہ ایسا ادارہ ہے جس میں حقیقی معنوں میں انسان بنائے جاتے ہیں۔ اصلی انسان وہی ہے جس میں اُنس ہو، عشق ہو، رواداری ہو، تمام بنی نوعِ انسان بلکہ تمام مخلوق سے پیار ہو۔ ہمیں یہاں اپنی زندگی کو عدم تشدد، سچائی، صفائیِ قلب، انکسار — اور خدمتِ خلق کے اعلیٰ ترین اصولوں پر ڈھالنا سکھایا جاتا ہے۔ یہاں ہمیں مثبت تصوف (POSITIVE MYSTICISM) کا درس دیا جاتا ہے۔ ہمارے فرائض اپنے والدین کی

طرف ہیں۔ اپنی فیملی کی طرف ہیں۔ اپنی برادری (COMMUNITY) اور سماج (SOCIETY) کی طرف ہیں۔ اپنی قوم کی طرف ہیں اور پھر بین الاقوامی (INTERNATIONAL) اور کائناتی یا آفاقی (COSMIC) سطح پر ہیں۔ ہمیں اِن سب فرائض کو اعلیٰ ترین طریقہ سے پورا کرنے کی ہدایت دی جاتی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ انسانی زندگی کے سب سے بڑے مقصد کے پانے کی بھی، جو خودشناسی اور خداشناسی ہے تلقین کی جاتی ہے۔ انسان اشرف المخلوقات ہے اس لیے ایسا کرنے سے ہماری دنیا بھی سنور جائے گی اور عافیت بھی سنور جائے گی۔

والدِ محترم کے وصالِ حق کے بعد پچھلے ۱۲ سال سے ساون کرپال روحانی مشن اور ان کی قائم کردہ مذاہب کی عالمی انجمن اور انسانی ایکتا کی عالمی انجمن کے چیئرمین ہونے کی حیثیت سے اِن جماعتوں کی تمام تر ذمہ داری میرے کندھوں پر ہے۔ اُن کی اور مرشدِ پاک کی نظرِ کرم سے یہ کام بڑی تیزی سے ترقی کر رہا ہے۔

پچھلے تیس چالیس برسوں میں سائنس نے حیرت انگیز ترقی کی ہے۔ انسان زمین کی جکڑ GRAVITATION سے آزاد ہو کر کہیں خلاؤں میں سیر WALKING کر رہا ہے۔ کہیں ستارہ گیر ہے اور کہیں کہکشاں شکار ہے۔ انسان آج بین السیّاری بن کر خلا میں آزاد پھرتا ہے۔ اُس کا زمینی شعور آج INTER PLANETARY یعنی بین السیّاری شعور میں بدل گیا ہے۔

اگر ہم سائنس کی موجودہ تفتیش و تحقیق (LATEST RESEARCH) پر لکھی گئی کتابوں کا، جن میں "SURER FORCE" (THE SEARCH FOR A GRAND UNIFIED THEORY OF NATURE) اور "THE TAO OF PHYSICS" وغیرہ شامل ہیں، مطالعہ کریں تو ہم اس نتیجے پر پہنچیں گے کہ جن حقیقتوں کا بیان ہمارے بزرگانِ دین روزِ ازل سے کرتے آئے ہیں انہیں کی تصدیق (CONFIRMATION) ہمارے سائنسداں اب کر رہے ہیں۔

اس دورِ انقلاب آفریں میں انسان کی سوچ اور فکر، تحریر و تکلم، تخیل و تجسس کا انداز بدل گیا ہے۔ چنانچہ "میرا نظریۂ شاعری" صرف شاعری تک محدود نہیں رہا۔ اس میں اب نثر بھی شامل ہے۔ میری محبت کی وہ آواز جو ایک خاص توازنِ آہنگ میں ڈھل کر نظم و غزل کی صورت اختیار کرتی تھی، اب مرصع نثر (POETIC PROSE) میں بھی رواں دواں ہے۔

میں نے تین عالمی دورے کیے ہیں اور عشقِ مخلوقات، خود شناسی اور خدا شناسی اور امنِ عالم کے مختلف پہلوؤں پر اسٹیج، ریڈیو اور ٹی وی کے ذریعے تقریریں کی ہیں۔ اُن میں سائنٹفک انداز اور اصطلاحات (TERMINOLOGY) میں روحانیت کو پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ان کا ترجمہ دنیا کی تقریباً چالیس اہم زبانوں میں ہو چکا ہے یا ہو رہا ہے۔ میری کوشش ہے کہ تمام بانیان دین کی تعلیمات کا نچوڑ دنیا کی ساری زبانوں میں پیش کیا جائے۔

ان تقاریر میں میں نے اپنے موزوں اور باموقع اشعار بھی شامل کیے ہیں۔ ان کے دو مجموعے SPIRITUAL AWAKENING اور SECRET OF SECRETS. شائع ہو چکے ہیں، اور دو مجموعے زیرِ ترتیب ہیں۔

ہمارے مشن کے ایسے لٹریچر کا ترجمہ جس میں میرے اردو اشعار شامل ہیں، مندرجہ ذیل تیئیس۲۳ عالمی زبانوں میں شائع ہو چکا ہے:

سنسکرت (SANSKRIT) عبرانی (HEBREW) عربی (ARABIC) یونانی (GREEK) فارسی (PERSIAN) انگریزی، فرانسیسی، جرمن، ہسپانوی (SPANISH) .... اطالوی (ITALIAN) روسی، چیکوسلوواکین (CZECHOSLOVAKIAN) ڈچ (DUTCH) سویڈش (SWEDISH) ہنگیرین (HUNGARIAN) لٹوین (LATVIAN) ہندی،

سندھی، گجراتی، مراٹھی۔ تیلگو (TELUGU) تامل (TAMIL) اور پنجابی۔

ان کے علاوہ نیچے دی گئی چھ زبانوں میں یہ لٹریچر زیر طبع ہے:

چینی (CHINESE) جاپانی (JAPANESE) پرتگالی (PORTUGESE) کیچوا (QUECHUA-PERU) امہارک (AMHARIC - ETHOPIA) اور بنگالی۔

نیز تیرہ ۱۳ اور زبانوں میں ترجمے کا کام جاری ہے جن میں جنوبی افریقہ کی زبانیں شامل ہیں۔

اس طرح شاید پہلی مرتبہ میری اردو شاعری کو یہ سعادت نصیب ہو رہی ہے کہ دنیا کی قریب چالیس بڑی بڑی زبانوں میں روحانیت، انسانیت، محبت اور امن کا پیغام لے کر پہنچے۔

میرے اشعار کے علاوہ اردو کے مشہور شعرا مرزا غالبؔ، محمد اقبالؔ، خواجہ میر دردؔ، مخمورؔ دہلوی، اور شمیمؔ کرہانی صاحب رفعت سروشؔ اور علی جواد زیدی اور فارسی کے نامور شعرا مولانا رومؔ، شمسؔ تبریز، شیخ سعدیؔ، خواجہ حافظؔ، نورالدین عبدالرحمان جامیؔ اور امیر خسروؔ کے چند اشعار جن کا حوالہ میں نے اپنی تقریروں میں دیا ہے، کا ترجمہ انگریزی، فرانسیسی، جرمن ہسپانوی، یونانی اور ہندی میں چھپ چکا ہے اور دیگر زبانوں میں ہو رہا ہے۔

ایں سعادت بزورِ بازو نیست
تانہ بخشد خدائے بخشندہ

بات لمبی ہو گئی، مگر اس سے کم لفظوں میں شاید پوری بھی نہ ہو سکتی تھی۔ مجھے اس حقیقت کے اعتراف میں تامل نہیں کہ اپنے ان خیالات کو

فنکارانہ طریقے سے شعر میں پیش کرنے میں اکثر قاصر رہا ہوں، لیکن دل میں جوش اور لگن ضرور ہے۔ اب تک میں یہی کوشش کرتا رہا ہوں اور آئندہ بھی اس کوشش میں زندگی گزار دینے کا عہد ہے۔

درشن سنگھ

۱۴ ستمبر ۱۹۸۷ء

○

خاک سے تا بہ کہکشاں، ہم نے تو جب کیا سفر
عشق ملا قدم قدم، حُسن ملا نظر نظر

کیسا خیالِ گمرہی، کیسا ہراسِ دشت و در
شوق ہے تیرا رہنما، یاد ہے تیری ہمسفر

ہم نے بھی جا کے دیکھ لی اہلِ خرد کی رہ گذر
سوئے ہوئے سے راہ رو، کھوئے ہوئے سے راہبر

کوئی ملے تو پوچھ لیں، موسمِ گُل تو ہے مگر
گردِ خزاں پڑی ہے کیوں آئینۂ بہار پر

اے دلِ بے قرار آ، رو لیں، تڑپ لیں، جاگ لیں
نیند کی فکر کیا ابھی، رات ملی ہے بے سحر

دل سے نکل کے ہر صدا کیوں نہ دلوں میں ڈوب جائے
ساز مرا لطیف ہے، نغمہ ترا لطیف تر

صبحِ ازل سے میں چلا، شامِ ابد تک آ گیا
عمرِ درازِ شوق ہے، میری حیاتِ مختصر

وسعتِ کائنات کی سیر کا ماحصل تو ہے
تیرے ہی در پہ آئے گا کل یہ تھکا ہوا بشر

اپنے ہی دوست کی تو ہیں جتنی ہیں یہ نشانیاں
دیر ملے تو سر جھکا، کعبہ ملے، سلام کر

وعدۂ دوست ہے فقط حرفِ فریبِ آرزو
رات گزر گئی تو پھر رات کا انتظار کر

حُسن سے بھی سوا ہے کچھ عشق کی روشنی ہمیں
وہ ہے چراغِ انجمن، یہ ہے چراغِ رہ گزر

دیکھیے حشر کیا ہو اب اپنے دلِ تباہ کا
میری نظر ہے اُس طرف، اُس کی نگاہ خود نگر

چشمِ کرم گراں سہی، چشمِ کرم نہ کیجیے
ہاں مگر اک نگاہِ ناز، درخورِ خستہ حال پر

لباسِ فقر میں ہمکو جو خاکسار ملے
انھیں کے در پہ سلاطینِ روزگار ملے

وہ راز جس سے سلگتا رہا ہے دل کہہ دیں
ہمارے دل سا اگر کوئی رازدار ملے

شراب خانۂ چشتی میں بھی نظر آئے
ہمیں جو اُلفتِ نانکؔ کے بادہ خوار ملے

غمِ جہاں نگری کا سفر قیامت تھا
ہر ایک ذرے کے سینے میں کوہسار ملے

کوئی بھی دوریٔ منزل نہیں اگر درشنؔ
جہاں کو میرا جنونِ خرد شکار ملے

○

ایسی نظر فروز تھی ، بزمِ گہہِ نگاہِ فن
میری نظر کو بھا گئی ، اہلِ نظر کی انجمن

نام ہے آدمی تو کیا ، اصل میں روحِ عشق ہوں
ساری زمیں ہے میرا گھر ، سارا جہاں مرا وطن

اہلِ دوئی کو عشق سے وحدتِ کیفیت ملی
بادہ کشوں میں بٹ گیا پیرِ مغاں کا پیرہن

پرتوِ عینِ ذات ہیں روشنیاں صفات کی
اصل میں دونوں ایک ہیں ، شیخ ہوں یا کہ برہمن

عِشق میں اور حُسن میں اتنا ہی امتیاز ہے
عِشق ہے رُکنِ انجمن، حُسن ہے صدرِ انجمن

کتنے چمن کِھلا گئیں آبلہ پائیاں مری
یاد رہے گا دشت کو میرے جنوں کا بانکپن

نقش و نگارِ حرف و لفظ وجہِ کشش سہی مگر
خونِ جگر سے ہم نفس! ہے یہ بہارِ فکر و فن

درشنِ خود نگر کو وہ جام عطا ہو ساقیا
پی کے جسے مٹا سکے دل سے تمیزِ ما و من

لہ اشارہ گورونانک دیوجی مہاراج کے وصالِ حق کی جانب ہے۔ "انہوں نے اپنی تجلّی خدا کی تجلّی میں شامل کردی، تو اُن کے ہندو اور مسلمان مریدوں میں جھگڑا شروع ہوا۔ مسلمان مُرید کہنے لگے کہ ہم ان کو دفنائیں گے، ہندو کہنے لگے کہ وہ اپنی رسم کے مطابق ان کا "داہ سنکار" کریں گے۔ آخر میں ہندوؤں اور مسلمانوں نے یہ فیصلہ کیا دونوں فریقین اپنے اپنے پھول ان کے جسم پر رکھ دیں۔ صبح جس فریق کے پھول کم پژمُردہ ہوں گے، وہی فریق ان کے جسم کا وارث ہوگا۔ صبح ہوئی دونوں فریقین کے پھول شگفتہ تھے اور مہک رہے تھے اور جب انہوں نے چادر اٹھا کر دیکھا تو کہتے ہیں کہ گروجی کا جسم غائب تھا۔ ہندوؤں اور مسلمانوں نے آدھی آدھی چادر بانٹ لی۔ ایک فریق نے نصف چادر کو دفنایا اور دوسرے فریق نے اپنی رسم کے مطابق اسے آگ کے سپرد کردیا۔" (بحوالہ ڈاکٹر گوپال سنگھ صاحب کی تصنیف "گرونانک دیو")

جب آدمی مدعائے حق ہے تو کیا کہیں مدعا کہاں ہے
خدا ہے خود جس کے دل میں پنہاں وہ ڈھونڈتا ہے خدا کہاں ہے

یہ بزمِ یارانِ خود نما ہے ، نہ کر خلوصِ وفا کی باتیں
سبھی تو ہیں مدعی وفا کے، یہاں کوئی بے وفا کہاں ہے

تمام پرتو ہیں عکسِ پرتو، تمام جلوے ہیں عکسِ جلوہ
کہاں سے لاؤں مثال صورت کہ آپ سا دوسرا کہاں ہے

نہاں ہیں تکمیلِ خود شناسی میں جلوہ ہائے خدا شناسی
جو اپنی ہستی سے بے خبر ہے، وہ آپ سے آشنا کہاں ہے

پڑی ہے سنسان دل کی وادی، اکیلا محوِ تلاش ہوں میں
کہ عشق کے راہ رو کدھر ہیں! وفاؤں کا قافلہ کہاں ہے!

جنہیں وسائل پہ ہے بھروسا، یہ بات اُن کو بتا دے کوئی
بچالے کشتی کو جو بھنور سے، خدا ہے وہ ناخدا کہاں ہے

پڑا ہی رہنے دو سر بسجدہ، نہ چھوٹنے دو یہ آستانہ
کہ درشنِ خستہ کا ٹھکانا تمہارے در کے سوا کہاں ہے

○

وہ سلیقہ ہمیں جینے کا سکھا دے ساقی
جو غمِ دہر سے بیگانہ بنا دے ساقی

جام و مینا مری نظروں سے ہٹا دے ساقی
یہ جو آنکھوں میں چھلکتی ہے پلا دے ساقی

شعلۂ عشق سے چھلکا دے مرے شیشے کو
اور بیتاب کو بیتاب بنا دے ساقی

حرم و دیر میں بٹ جاتے ہیں رندانِ وفا
حرم و دیر کی تفریق مٹا دے ساقی

سن رہا ہوں کہ میسر ہی نہیں دنیا میں
اک نگہ، رازِ دو عالم جو بتا دے ساقی

خشک ہے موسم احساس، فضا پیاسی ہے
خُم کے خُم سینۂ گیتی پہ لنڈھا دے ساقی

پھر کبھی ہوش نہ آئے تو کوئی بات نہیں
آج ہم جتنی پئیں اُتنی پلا دے ساقی

جوشِ مستی میں بغلگیر ہوں بچھڑے ہوئے دل
آج انسان کو انسان بنا دے ساقی

زندگی خوابِ مسلسل کے سوا کچھ نہ سہی
اس کی تعبیر تو درشن کو بتا دے ساقی

○

کیا بتائیں ہم تمہیں کیفیتِ دربارِ دوست
وجد میں ہیں جام و مینا رقص میں انوارِ دوست

گوشے گوشے سے نمایاں ہو گئے انوارِ دوست
ذرّہ ذرّہ دے رہا ہے مژدۂ دیدارِ دوست

سرزمیں در سرزمیں میرے لئے اُس کا جمال
آسماں در آسماں میرے لئے دیدارِ دوست

اس کو اے محرومِ جلوہ دل کی بینائی سے دیکھ
دیکھتا ہے ظاہری آنکھوں سے کیا انوارِ دوست

آدمی کا دکھ اٹھایا، پیار دنیا سے کیا
جان و دل سے عمر بھر کرتا رہا ہیں کارِ دوست

چھیڑ کر دل کو نکل جاتی ہے کتراتی ہوئی
لو نسیمِ صبح نے بھی سیکھ لی رفتارِ دوست

قید مندر کی، نہ مسجد کی، نہ گرجا گھر کی ہے
چشمِ بینا ہو تو ہر ذرّے میں ہیں آثارِ دوست

طالبِ جلوہ تیرے دل سے بہت نزدیک ہیں
چشمِ ظاہر بیں سے کوسوں دور ہیں انوارِ دوست

کیا کہیں درشن تصوّر کی کرم فرمائیاں
بند کیں آنکھیں نظر آنے لگے انوارِ دوست

○

جو خود کو زیرِ حلقۂ گرداب لے گیا
اس بحر سے وہ گوہرِ نایاب لے گیا

عرشِ عظیم تک دلِ بے تاب لے گیا
پھر اُس کے بعد شوق کا سیلاب لے گیا

خاموش ہوں خرابۂ اِمروز دیکھ کر
ماضی میرے جہان کا ہر خواب لے گیا

اب ہم نشیں ہے یاد، نہ پہلو نشیں ہے درد
دل کیا گیا کہ مجمعِ احباب لے گیا

اے جانِ خواب! تیرے شبستانِ خواب سے،
جو بھی گیا، وہ دیدۂ بے خواب لے گیا

پینے کا ہے شعور، نہ مے کا ہے احترام
ساقی گیا کہ بزم کے آداب لے گیا

لکھی تھی جس میں عہدِ محبت کی داستاں
کوئی کتابِ دل کا وہی باب لے گیا

بحرِ بلا میں کوئی نہیں اب مرے سوا
ہر آشنا کو وقت کا سیلاب لے گیا

پائے نہ کیوں شہیدِ وفا عمرِ جاوداں
وہ اپنے ساتھ زیست کے اسباب لے گیا

اِنساں زمیں کو دے نہ سکا آشتی کا نور
خود کو اگرچہ تا سرِ مہتاب لے گیا

آج آ رہی ہے میرؔ کے مرقد سے یہ صدا
"مژگاں تو کھول شہر کو سیلاب لے گیا"

درشنؔ ہمارے پاس کہاں اب متاعِ دل
اک دلستاں وہ دولتِ نایاب لے گیا

○

لکھے گی آبِ زر سے زندگی کل تیرا افسانہ
گزر بھی جا جہانِ رنگ و بو سے بے نیازانہ

وہی ہم ہیں، وہی مے ہے، وہی مینا و پیمانہ
نہیں ساقی تو میخانہ نظر آتا ہے ویرانہ

نہیں ہے ہوش تن من کا دفورِ یاس و حسرت سے
ہوا جاتا ہے کس کے ہجر میں ہر رِند دیوانہ

لرزتی شمع کی لو کیا جلا سکتی ہے اوروں کو
جلا کرتا ہے سوزِ عشق میں خود اپنے پروانہ

سرِ میخانہ درشن کو جو ہو جائے ترا درشن
چھلک اُٹھے صراحی وجد میں آجائے پیمانہ

محبّت کی متاعِ جاودانی لے کے آیا ہوں
تیرے قدموں میں اپنی زندگانی لے کے آیا ہوں

کہاں سیم و گہر جن کو لٹاؤں تیرے قدموں پر
برائے نذر، اشکوں کی روانی لے کے آیا ہوں

تجھے جو پوچھنا ہو پوچھ لے اے داورِ محشر
میں اپنے ساتھ اپنی بے زبانی لے کے آیا ہوں

زمین و مُلک کے بدلے دلوں پر ہے نظر میری
اچھوتا اک طریقِ حکمرانی لے کے آیا ہوں

مرے زخمِ تمنا دیکھ کر پہچان لو مجھ کو
تمہاری ہی عطا کردہ نشانی لے کے آیا ہوں

مرے اشعار میں مضمر ہیں لاکھوں دھڑکنیں دل کی
میں اک دنیا کا غم دل کی زبانی لے کے آیا ہوں

محبّت نام ہے بیتابیٔ دل کے تسلسل کا
محبّت کی میں درشن یہ نشانی لے کے آیا ہوں

○

سُبو کا دور ہے، رقصاں ہے زندگی میری
حریفِ گردشِ دوراں ہے زندگی میری

نفس نفس مجھے لازم ہے شکر کا سجدہ
کہ میرے دوست کا احساں ہے زندگی میری

چلا ہے میری طرف لے کے جامِ مُل ساقی
چراغِ شامِ بہاراں ہے زندگی میری

تلاطمِ غمِ ہستی سے کیا ڈراتے ہو
کہ آپ شورشِ طوفاں ہے زندگی میری

کھلے گی آنکھ تو دیکھیں گے منزلِ تعبیر
ابھی تو خوابِ پریشاں ہے زندگی میری

رفوگرانِ شبِ انتظار سے کہہ دو
سحر سے چاک گریباں ہے زندگی میری

تری حیات، شبستانِ حسن کا فانوس
چراغِ شامِ غریباں ہے زندگی میری

اجل کے بعد حیاتِ ابد کی منزل ہے
کہ جزوِ خاکِ شہیداں ہے زندگی میری

ہو زندگی سے ملاقات کس طرح درشن
نفس نفس تو گریزاں ہے زندگی میری

○

کسی کی شامِ سادگی، سحر کا رنگ پا گئی
صبا کے پاؤں تھک گئے، مگر بہار آ گئی

چمن کی جشن گاہ میں اُداسیاں بھی کم نہ تھیں
جلی جو کوئی شمعِ گل، کلی کا دل بُجھا گئی

بُتانِ رنگ رنگ سے بھرے تھے بُت کدے مگر
تری ادائے سادگی مری نظر کو بھا گئی

چراغِ شب کے حال پر ٹپک رہے تھے اشکِ دل
بڑی ستم ظریف تھی سحر جو مُسکرا گئی

نگاہِ ساقیِ ازل عجب کرشمہ ساز تھی
جنوں کی آنکھ کھُل گئی، خِرد کو نیند آگئی

مری نگاہِ تشنہ لب کی سرخوشی نہ پوچھیے
کہ جب اُٹھی نگاہِ ناز، پی گئی، پلا گئی

غریبِ دشت کے لیئے انیسِ وقت کون تھا
بس ایک شامِ بےکسی گلے سے جو لگا گئی

خزاں کا دور ہے مگر، وہ اس ادا سے آئے ہیں
بہارِ درشنِ حزیں کی زندگی پہ چھا گئی

○

کب خموشی کو محبّت کی زباں سمجھا تھا میں
تھا عیاں وہ رازِ دل جس کو نہاں سمجھا تھا میں

سُن رہا ہوں اپنی خاموشی کا چرچا کو بکو
"تھی فغاں وہ بھی جسے ضبطِ فغاں سمجھا تھا میں"

عارضی سا عکس تھا اک التفاتِ دوست کا
جس کو نادانی سے عیشِ جاوداں سمجھا تھا میں

تم نے آنکھیں پھیر لیں مجھ سے تو یہ مجھ پر کھلا
خارزارِ زندگی کو گلستاں سمجھا تھا میں

وہ بھی نکلے برق و باد و باغباں کی ملکیت
چار تنکے جن کو اپنا آشیاں سمجھا تھا میں

کر سکیں درشن نہ وہ بھی عرضِ حالِ آرزو
جن نگاہوں کو محبت کی زباں سمجھا تھا میں

○

جب کبھی ساقیٔ مدہوش کی یاد آتی ہے
نشّہ بن کر مری رگ رگ میں سما جاتی ہے

ڈر یہ ہے ٹوٹ نہ جائے کہیں میری توبہ
چار جانب سے گھٹا گھر کے چلی آتی ہے

مُسکراتی ہے کلی، پھول ہنسے پڑتے ہیں
میرے محبوب کا پیغام صبا لاتی ہے

زندگی خوش ہے اِسی کشمکشِ پیہم سے
زندگی میں نہ کشا کش ہو تو گھبراتی ہے

جان پروانے کی لینے کو تو لے لی لیکن
اپنے انجام پہ لَو شمع کی تھرّاتی ہے

جب کبھی زیست کے اوراق پہ جاتی ہے نظر
یاد گزرے ہوئے ایّام کی آجاتی ہے

دور کے ڈھول تو ہوتے ہیں سُہانے درشن
دور سے کتنی حسیں برق نظر آتی ہے

○

اللہ! اللہ! لطف کیا ساقی کے میخانے میں ہے
جلوہ گر رازِ دو عالم اس کے پیمانے میں ہے

دیر میں کیا جستجو ہے؟ کیا ہے کعبے میں تلاش؟
چشمِ باطن کھول وہ دل کے صنم خانے میں ہے

صبح تک میری بھی خاکستر ملے گی دوستو
دل میں ہے وہ سوزِ غمخواری جو پروانے میں ہے

چشمِ ساقی نے چھپا رکھی ہے صہبائے یقیں
ہے فریبِ تشنگی جو کچھ کہ پیمانے میں ہے

کون جانے کیا تماشا ہے کہ سازوں کے بغیر
اِک ہجومِ نغمگی دل کے نوا خانے میں ہے

ساقیا! کیوں کشتۂ رحمت ہے میری آرزو
اک سرورِ سرمدی سنتا ہوں میخانے میں ہے

بیٹھے بیٹھے خود مجھے ہوتا ہے اکثر یہ گماں
نغمہ گر مطرب کوئی دل کے طرب خانے میں ہے

زندگی میں تجھ کو درشن مل نہیں سکتا کہیں
وہ سرور و کیف جو مرشد کے خم خانے میں ہے

○

عشق دلکش ہے نہ اب یادِ جواں ہے اے دوست
غمِ دوراں سے ہر اک اشک فشاں ہے اے دوست

ناز تھا جس پہ مجھے، جس پہ بھروسہ تھا مجھے
آج وہ دل ہی مرا دشمنِ جاں ہے اے دوست

ذرّے ذرّے سے ہویدا ہے جہاں رنگِ حیات
میری نظروں میں اک ایسا بھی جہاں ہے اے دوست

تیری زلفوں کی گھنی چھاؤں میں دم لے لیتا
اتنی فرصت غم دوراں سے کہاں ہے اے دوست

منزلِ دیر و حرم سے مجھے مطلب کیا ہے ؟
میری منزل تو وہیں ہے تو جہاں ہے اے دوست

ہو گئی شدّتِ غم آپ مداوا غم کا
آنکھ میں اشک نہ ہونٹوں پہ فغاں ہے اے دوست

دورِ حاضر میں پا جاتا ہے انساں کا ضمیر
خیر و شر میں وہ کشاکش سی عیاں ہے اے دوست

آشیاں باغ میں درشن بھی بنا لیتا مگر
باغباں کا اسے احسان گراں ہے اے دوست

گُلوں پہ خاکِ محن کے سوا کچھ اور نہیں
چمن میں یادِ چمن کے سوا کچھ اور نہیں

کہاں کی منزلِ رنگیں، سحر تو ہونے دو
ہمارے خواب، تھکن کے سوا کچھ اور نہیں

یہ شامِ غُربتِ دل ہے، یہاں چراغ کہاں!
خیالِ صبحِ وطن کے سوا کچھ اور نہیں

نگاہِ شوق! مسلسل اُسی کو چھیڑے جا
جبیں پہ جس کی شکن کے سوا کچھ اور نہیں

دیارِ عشق میں تم کیوں کھڑے ہو اہلِ ہوس؟
یہاں تو دار و رسن کے سوا کچھ اور نہیں

سوادِ شامِ خزاں ہے تو ہو ہمیں کیا غم
نظر میں صبحِ چمن کے سوا کچھ اور نہیں

کرے تلاشِ جنوں، ظلمتِ خرد سے کہو
جنوں کرن ہے، کرن کے سوا کچھ اور نہیں

ہماری نغمہ سرائی کے واسطے درشنؔ
ہوائے گنگ و جمن کے سوا کچھ اور نہیں

○

جذبۂ دل کو عمل میں کبھی لاؤ تو سہی
اپنی منزل کی طرف پاؤں بڑھاؤ تو سہی

زندگی وہ جو حریفِ غمِ ایام رہے
دل شکستہ ہے تو کیا، ساز اُٹھاؤ تو سہی

جاگ اُٹھے گی یہ سوئی ہوئی دنیا، لیکن
پہلے خوابیدہ تمنّا کو جگاؤ تو سہی

پھول ہی پھول ہیں کہتے ہو جنہیں تم کانٹے
میری دنیائے جنوں میں کبھی آؤ تو سہی

تمہیں آباد نظر آئے گی اُجڑی دنیا
دل کی دنیا کو محبت سے بساؤ تو سہی

زندگی پھر سے جواں پھر سے حسیں ہو جائے
اُن کی آنکھوں سے ذرا آنکھ ملاؤ تو سہی

کرتے پھرتے ہو اندھیرے کی شکایت درشن
دل کی دنیا میں کوئی دیپ جلاؤ تو سہی

مستانہ ہوائیں چلنے لگیں آؤ چھلکائیں جامِ غزل
پیغامِ شمیمِ گلشن سے رنگین ہوئی پھر شامِ غزل

موسم کے نگارو آجاؤ ہونٹوں پہ لئے پیغامِ غزل
تکتا ہے تمہاری آہٹ کو ہر صحنِ غزل ، ہر بامِ غزل

یہ ڈھلتی رات کی تنہائی ، یہ چشمِ تمنّا بھیگی ہوئی
یہ دردِ جنوں کی بیداری ، فیضانِ غزل ، انعامِ غزل

موسم کا تبسّم کیا کہیے، گویا ہے غزل کا شعر کوئی
شانوں پہ نہیں گیسوئے سیہ پھینکا ہے کسی نے دامِ غزل

آنکھوں کو اُجالے ملتے ہیں، خوابوں کے شگوفے کھلتے ہیں
کیا بات ہے عارض و گیسو کی، اک صبحِ غزل، اک شامِ غزل

ہر گام پہ لہرا جاتی ہے سپنوں کی کرن، ارمان کی لو
تاروں میں ڈھلنے لگتی ہے جب حورِ سبک اندامِ غزل

اشعارِ غزل پر رکھ دینا تیشا نہ کہیں تنقیدوں کا
شیشے سے بھی نازک ہوتے ہیں یہ سیم بدن اصنامِ غزل

افکارِ شمیمِ دانا سے دنیائے ادب میں اے درشن
تاباں و حسیں ہے صبحِ سخن، رنگین و جواں ہے شامِ غزل

○

وہ زینتِ پہلو ہیں، مہتاب ہے، گلشن ہے
محسوس یہ ہوتا ہے، یہ رات سہاگن ہے

اے جانِ حیا تیری خلوت کا ہے کیا عالم!
سہمی ہوئی نظریں ہیں، سمٹا ہوا دامن ہے

اب راہِ محبت میں لٹ جانے کے دن آئے
اے دل نہ بچا خود کو اپنا ہی تو رہزن ہے

بتلائیں تو ہم کیسے، سمجھائیں تو ہم کیونکر
گمنام سی خواہش ہے انجان سی اُلجھن ہے

ہر دوست کے چہرے پر صد رنگ نقابیں ہیں
دشمن تو بہر صورت معلوم ہے دشمن ہے

بربادیِ گلشن کے اسباب فراہم ہیں
گلچیں ہے، شگوفے ہیں، بجلی ہے، نشیمن ہے

ہر موڑ پہ گلشن کے رُکتے ہیں قدم درشن
کانٹوں کی شرارت ہے یا شوخیِ دامن ہے

○

○

سہما ہوا حیا کی شفق میں شباب ہے
یا ڈوبتا ہوا سرِ شام آفتاب ہے

اُس حُسنِ دلفریب سے اُلفت کی آرزو
اک وہم ہے، گماں ہے، تصوّر ہے، خواب ہے

اے گردشِ زمانہ مجھے آزمائے جا
ہے تابِ ضبط کی مجھے اور بے حساب ہے

اوروں کے واسطے مے و مینا و رقصِ جام
اپنے لیے تو خونِ تمنّا شراب ہے

یک رنگیٔ حیات سے گھبرا گئے ہیں دل
ہر ذرّہ آج منتظرِ انقلاب ہے

جنبش سی ہو رہی ہے کسی کے نقاب میں
درشنؔ ہماری سعیٔ نظر کامیاب ہے

○

○

کلیاں متبسم ہیں، صبا چھیڑ رہی ہے
وہ روٹھ گئے ہیں، تو فضا چھیڑ رہی ہے

ڈر ہے کہ چمن میں کہیں پھر آگ نہ لگ جائے
بجھتے ہوئے شعلوں کو ہوا چھیڑ رہی ہے

مدّت ہوئی نظروں نے میری چھیڑ دیا تھا
اب تک اُنہیں خود اُن کی حیا چھیڑ رہی ہے

ہنستا ہوا موسم ہے ٹپک جائیں نہ آنسو
بیکار مرے دل کو صبا چھیڑ رہی ہے

سچ مچ کوئی آواز ہے، سچ مچ کوئی آہٹ
یا دل کے دھڑکنے کی صدا چھیڑ رہی ہے

مظلوم کو مظلوم بھی رہنے نہیں دیتے
چپ ہوں تو زمانے کی ہوا چھیڑ رہی ہے

محسوس یہ ہوتا ہے ہر اک سانس میں درشنؔ
زندہ ہوں مگر مجھ کو قضا چھیڑ رہی ہے

○

وہ پیکرِ بہار تھے، جدھر سے وہ گزر گئے
خزاں نصیب راستے بھی سج گئے سنور گئے

یہ بات ہوش کی نہیں یہ رنگ بیخودی کا ہے
میں کچھ جواب دے گیا، وہ کچھ سوال کر گئے

میری نظر کا ذوق بھی شریکِ حُسن ہو گیا
وہ اور بھی سنور گئے، وہ اور بھی نکھر گئے

یں رہزنوں سے تو بچا رہِ حیات میں، مگر
جو کام رہزنوں کا تھا، وہ راہبر ہی کر گئے

نہ جامِ مُل، نہ شامِ گُل، چمن اُداس اُداس ہے
وہ کیا رُکے کہ قافلے بہار کے ٹھہر گئے

ہمیں تو شوقِ جستجو میں ہوش ہی نہیں رہا
سُنا ہے وہ تو بارہا قریب سے گزر گئے

نوائے درد مِشنِ حزیں بہت نحیف تھی مگر
فضائے دل کی خامشی میں پھول سے بکھر گئے

○

نگاہِ مستِ ساقی کا سلام آیا تو کیا ہوگا
اگر پھر ترکِ توبہ کا پیام آیا تو کیا ہوگا

حرم والے تو پوچھیں گے بتا تو کس کا بندہ ہے
خدا سے پہلے لب پر اُن کا نام آیا تو کیا ہوگا

مجھے منظور اُن سے میں نہ بولوں گا مگر ناصح
اگر اُن کی نگاہوں کا سلام آیا تو کیا ہوگا

چلا ہے آدمی تسخیرِ مہر و ماہ کی خاطر
مگر صیّاد ہی خود زیرِ دام آیا تو کیا ہو گا

مجھے ترکِ طلب منظور، لیکن یہ تو بتلا دو
کوئی خود ہی لیے ہاتھوں میں جام آیا تو کیا ہو گا

محبّت کے لیے ترکِ تعلّق ہی ضروری ہو
محبّت میں اگر ایسا مقام آیا تو کیا ہو گا

جہاں کچھ خاص لوگوں پر نگاہِ لطف ہے درشنؔ
اگر اس بزم میں دورِ عوام آیا تو کیا ہو گا

○

جبیں کس کس طرح اُس در پہ ٹھکرائی نہیں جاتی
مگر انسان کی خوئے جبیں سائی نہیں جاتی

محبّت جذبۂ بے اختیارِ دل کو کہتے ہیں
گھٹا یہ خود برس جاتی ہے، برسائی نہیں جاتی

کوئی تو بات ہے نظروں میں جو رازِ محبت ہے
تو پھر ہونٹوں سے کیوں ارشاد فرمائی نہیں جاتی

وفا سے بڑھ کے دنیا میں کوئی شے ہو نہیں سکتی
مگر یہ جنس دنیا میں کہیں پائی نہیں جاتی

مِلا کیا چاند پر بھی جا کے مٹّی کے سوا آخر
جُنونِ شوق کی یہ چرخ پیمائی نہیں جاتی

محبّت کی نظر کیا چیز ہے پوچھو نہ اے درشنؔ
سمجھ میں آپ آجاتی ہے، سمجھائی نہیں جاتی

○

جس پہ رحمت سے بھری ایک نظر ہو جائے
دین و دنیا سے وہ بیگانہ بشر ہو جائے

دارِ فانی میں ہی مل جائے سرورِ ابدی
زندگی وقفِ خدا بات اگر ہو جائے

اتنا طوفان اُٹھاؤ نہ مرے ہم سفر و
ڈر ہے کشتی نہ کہیں زیر و زبر ہو جائے

اَن گِنت زخموں سے کِھلتا ہوا یہ دل کا چمن
آرزو ہے کہ تری راہ گزر ہو جائے

شعر وہ شعر جو آواز ہو خاموشی کی
بے زباں بن کے جو پیغام نظر ہو جائے

امتحاں ہے نگہِ شوق کی بیتابی کا
ہم تو خاموش رہیں اُن کو خبر ہو جائے

جلوۂ دوست! تجھے اپنے تبسّم کی قسم
میری دنیا میں بھی اک بار سحر ہو جائے

محفلِ حلقۂ اربابِ جنوں ہے در پیش
بیٹھ جائے جو یہاں اہلِ نظر ہو جائے

○

ترا حسن شام و سحر دیکھتے ہیں
فروزندہ شمس و قمر دیکھتے ہیں

نہ پہنچے مسافر ترے نقشِ پا تک
ابھی راہ میں سنگِ در دیکھتے ہیں

جو بیٹھے ہیں آکر سرِ بزمِ ساقی
اُنہیں آج شیر و شکر دیکھتے ہیں

جنھیں تو نے سودائے سجدہ دیا ہے
وہ سر دیکھتے ہیں نہ در دیکھتے ہیں

ملی ہے جنھیں کچھ خبر میرے ساقی
انھیں بزم میں بے خبر دیکھتے ہیں

جن اہلِ جنوں کو ہے سودائے منزل
وہ رہرو نہیں رہ گزر دیکھتے ہیں

عجب حال ہے تیرے درشن کا مرشد
ہمیشہ اُسے چشم تر دیکھتے ہیں

○

○

ترے بغیر تو میرا عجیب عالم ہے
کہ زندگی کی مسرّت، نہ موت کا غم ہے

ہزار دل ہیں دھڑکتے ہوئے زمانے میں
مگر وہ دل کہ جو دردِ بشر کا محرم ہے!!

ترس رہا ہوں میں اک لمحۂ سکوں کے لئے
یہ زندگی تو نہیں، زندگی کا ماتم ہے

تمام عالمِ فانی نے ساتھ چھوڑ دیا
بس ایک مرشدِ کامل ہی میرا ہمدم ہے

یہ بزمِ اہلِ ہوس ہے یہاں خلوص کہاں!
یہاں تو جام بہت ہیں، شراب ہی کم ہے

ترے نثار، مجھے تو نے بخش دی جنّت
ترا خیال ہی رنگینیوں کا عالم ہے

وہ اور ہیں جنہیں اپنا ہی غم ہے اے ہمدم
ہمارے دل میں تو سارے جہان کا غم ہے

ادب سے دیکھ رہے ہیں مجھے مہ و خورشید
نہ جانے کس کے قدم پر مری جبیں خم ہے

مزاجِ دوست کی رنگینیاں بتائیں کیا
کبھی وہ شعلہ ہے یارو، کبھی وہ شبنم ہے

وہ سر کہ جس کو نہ سجدے سے تھی کوئی نسبت
نہ جانے کیوں ترے در پر وہ دیر سے خم ہے

عطا ہوا ہو جو خود دستِ ناز سے درِ ششن
مجھے وہ جامِ سفالیں ہی ساغرِ جم ہے

○

اُدھر ہمارا ہے آشیانہ، بہار کا رُخ جدھر نہیں ہے
ملا ہے محفل کا ایسا گوشہ کہ جس پہ اُن کی نظر نہیں ہے

وہ کیا نکھاریں گے مہر و مہ کو، وہ کیا سنواریں گے کہکشاں کو
چلے ہیں جو آسماں کی جانب زمیں کی لیکن خبر نہیں ہے

بدل گئی ہے ہوائے دنیا کہ آپ ہی کچھ بدل گئے ہیں
وہ کیف آگیں ادا نہیں ہے، وہ روح پرور نظر نہیں ہے

جہاں مَلک سے بشر ہے آگے نظر میں اپنی ہے وہ بھی منزل
اگرچہ کہتے ہیں کہنے والے مَلک سے آگے بشر نہیں ہے

جو دورِ حاضر کی لوحِ دل پر ہے دورِ ماضی کا نقش باقی
وہ نقش، خضرِ سفر ہے درشن، وہ گردِ راہِ سفر نہیں ہے

رکھنا قدم محال تھا اس دلدہی کے ساتھ
کوئی بھی چل سکا نہ مری زندگی کے ساتھ

اُٹھی ہے جھومتی ہوئی توبہ شکن گھٹا
کوئی پلا دے آج تو دریا دلی کے ساتھ

غیروں پہ التفات رہا ان کا ہر گھڑی
ہم سے اگر ملے تو ملے بے رُخی کے ساتھ

دیوانے کا تھا ظرف کہ سب کچھ وہ سہہ گیا
کیا کیا نہ حادثات ہوئے زندگی کے ساتھ

اکثر شریکِ راہ تری یاد بھی نہ تھی
گزری ہے زیست اپنی بڑی بے کسی کے ساتھ

اک لمحۂ بہار ملا وہ بھی خوں شدہ
"یہ حادثہ چمن میں ہوا ہر کلی کے ساتھ"

درشنؔ شرابِ الفتِ ساقی کی بات کر
ہاں زندگی گزار مگر بے خودی کے ساتھ

○

بہت مشکل ہے ترکِ آرزو ربط آشنا ہو کر
گزر جا وادیِ پُرخار سے بادِ صبا ہو کر

لگا دو گے تمنّا کے سفینے کو کنارے سے
معاذاللہ! دعوائے خدائی ناخدا ہو کر!

ہر اک سو سلسلہ رنگیں گناہوں کے سلاسل کا
نہیں آسان دنیا سے گزرنا پارسا ہو کر

میری پہنائیِ علم و خبر کی انتہا یہ ہے
کہ اک قطرے سے ناواقف ہوں دریا آشنا ہو کر

کہاں تابِ جدائی، اب تو یہ محسوس ہوتا ہے
کہ میں خود سے جدا ہو جاؤں گا تم سے جدا ہو کر

ترا در چھوڑ دوں لیکن ترے در کے سوا ساقی
کہاں جاؤں؛ کدھر جاؤں؛ زمانے سے خفا ہو کر

جو شکوہ ان سے کرنا تھا وہ ان کے روبرو درشن
زباں تک آتے آتے رہ گیا حرفِ دعا ہو کر

○

ہنسی کا راز کیا جانیں، خوشی کا راز کیا جانیں
جو اہلِ غم نہیں وہ زندگی کا راز کیا جانیں

غمِ دوراں، بقیدِ ہوش جھیلے جا نہیں سکتے
خرد والے ہماری بے خودی کا راز کیا جانیں

کسی پر جان دینا مقصدِ ہستی سمجھتے ہیں
نہ ہم سے پوچھیے، ہم زندگی کا راز کیا جانیں

نہیں شایانِ ضبطِ غم، بیانِ دردِ پنہانی
جو نکتہ داں نہیں، وہ خامشی کا راز کیا جانیں

جو ہیں نا آشنا غم ہائے کیف و کم کی تلخی سے
وہ رندوں کی مسلسل مے کشی کا راز کیا جانیں

حجابِ ظاہری در پردہ رشتے کی ضمانت ہے
تماشائی تمہاری بے رُخی کا راز کیا جانیں

ستم پرور عناصر، شر پسندی کام ہے جنکا
ہمارے ذوقِ امن و آشتی کا راز کیا جانیں

نہیں ہے جن کی نظروں میں جمالِ صبحِ جمہوری
وہ ارضِ ہند کی تابندگی کا راز کیا جانیں

محبت کارسازِ ایں و آں ہے بزمِ امکاں میں
نہیں جو اہلِ دل وہ عاشقی کا راز کیا جانیں

پسندِ خاطرِ رحمت ہے احساسِ خطا کاری
جہاں والے مری شرمندگی راز کیا جانیں

نہیں ہے جن کے دل میں آدمی کا درد اے درشن
وہ میری درد آگیں شاعری کا راز کیا جانیں

○

○

رہِ عشق کی انتہا چاہتا ہوں
جنوں سا کوئی رہنما چاہتا ہوں

جو عرفان کی زندگی کو بڑھا دے
میں وہ بادۂ جانفزا چاہتا ہوں

مٹا کر مجھے آپ میں جذب کر لے
بقا کے لیے میں فنا چاہتا ہوں

بیاں حال دل میں کروں کیوں زباں سے
خدا جانتا ہے میں کیا چاہتا ہوں

مرے چارہ گر میں ہوں بیمار تیرا
ترے ہاتھ سے ہی شفا چاہتا ہوں

○

ہنسی گلوں میں ستاروں میں روشنی نہ ملی
ملے نہ تم تو کہیں بھی ہمیں خوشی نہ ملی

نہ چاند میں، نہ شفق میں، نہ لالہ و گل میں
جو آپ میں ہے کہیں بھی وہ دلکشی نہ ملی

نگاہِ لطف کی ہے منتظر مری شبِ غم
ستارے ڈوب چلے اور روشنی نہ ملی

ہمیں کو سونپ دیے کُل جہاں کے رنج والم
کسی میں اور ہماری سی دل دہی نہ ملی

نگاہِ دوست نے بخشی جو دل کو مدہوشی
شراب و جام سے ہم کو وہ بے خودی نہ ملی

ہر اک نشاط میں پنہاں ملا نشاط کا غم
جو عیش سے ہو بسر ایسی زندگی نہ ملی

مرے خیال میں ہیں یہ تجلّیاں کس کی
اندھیری رات میں بھی مجھ کو تیرگی نہ ملی

وہی فضا، وہی گلشن، وہی ہوا ہے مگر
ملی جو گُل کو وہ خاروں کو زندگی نہ ملی

گلہ کریں گے نہ اب میرے بعد کے رہرو
کہ ان کو راہِ محبت میں روشنی نہ ملی

ہزار بار ہوا خونِ آرزو، لیکن
کبھی کسی کو مری آنکھ میں نمی نہ ملی

جو چھیڑتی مرے بیتاب دل کے تاروں کو
کسی بھی ساز میں درشن وہ نغمگی نہ ملی

○

یہ کیسے مان لوں اُن کے پیام آ نہ سکے
پیام آئے مگر میرے نام آ نہ سکے

کُھلا تھا کیف تری چشمِ مست کا جس میں
مرا نصیب کہ مجھ تک وہ جام آ نہ سکے

ہوس پرستیٔ گلچیں کی بات کیا کہیے
چمن کے پھول چمن کے ہی کام آ نہ سکے

مزا ہی کیا ہے چمن میں بہار آنے کا
جو با وقار و بہ صد احترام آ نہ سکے

حضورِ پیرِ مغاں کیا مذاق ہے درشن
جسے ہو پیاس وہی تشنہ کام آ نہ سکے

ہائے جس اہلِ نظر نے تجھے دیکھا ہو گا
وہ تماشائی تو کیا ہو گا، تماشا ہو گا

تیرے دامن پہ جو ٹپکا ہے یہ میرا آنسو
آج آنسو ہی سہی، کل تو ستارا ہو گا

شعلہ شیشے سے گرے گا تو کرن پھوٹے گی
آنکھ ساقی سے ملے گی تو سویرا ہو گا

جام و مینا کو جو ٹھکرا کے اُٹھا محفل سے
آپ کے جلوۂ رنگیں کا وہ پیاسا ہو گا

یہ جمالِ مہ و خورشید، یہ حُسنِ عالم
میرے محبوب کا عکسِ رُخِ زیبا ہو گا

ہائے اُس پھول کی قیمت کوئی مجھ سے پوچھے
اُس نے بیکار سمجھ کر جسے پھینکا ہو گا

آج پامالِ خزاں ہے، مگر اے دل کب تک!
کل خرابہ یہی جنّت کا نمونہ ہو گا

ارتقا کا یہ مسافر جسے کہتے ہیں بشر
کتنے پُرہول مراحل سے یہ گزرا ہو گا

اشک آنکھوں میں، نہ لب پر کوئی شکوہ درشن
اب نئے طور سے اظہارِ تمنّا ہو گا

○

○

دل اپنا مے کشی کا طلبگار بھی نہیں
ہاں وہ اگر پلائیں تو انکار بھی نہیں

عہدِ وفا کی صبح کا کیا ذکر دوستو
عہدِ وفا کی صبح کے آثار بھی نہیں

ظلمت کدہ ہے ایسا صنم خانۂ خرد
جس میں جنوں کا گوشۂ انوار بھی نہیں

سونا پڑا ہے دیر سے میخانۂ وفا
ساقی کا ذکر کیا کوئی میخوار بھی نہیں

گلشن اُجاڑ ہو گیا دنیا بدل گئی
کیا ڈھونڈتے ہو گل کہ یہاں خار بھی نہیں

درشن نہ پوچھو ظلمتِ دنیائے عاشقی
کوئی چراغ اب تو سرِ دار بھی نہیں

وقت آیا ہے چارہ سازی کا
اور ہے دور بے نیازی کا

وہ ہزاروں سے دل لگاتا ہے
جس کو دعویٰ ہے پاکبازی کا

ابروؤں پہ شکن، نظر برہم
سب ہے سامان دل نوازی کا

کوئی آتا رہا تصوّر میں
دل بھٹکتا رہا نمازی کا

کوئی ساعت تو چارہ سازی کی!
کوئی موقع تو سرفرازی کا!

نفس کو اپنے جس نے رام کیا
زیب اُس کو لقب ہے غازی کا

میں سراپا نیاز ہوں درشن
خاتمہ اُس پہ بے نیازی کا

○

ہوش والوں کو سراسیمہ و حیراں دیکھا
تیرے دیوانے کو ہر حال میں شاداں دیکھا

ڈبڈبائی ہوئی آنکھیں جو اُٹھائیں شبِ غم
تو ستاروں کے قریب آپ کو خنداں دیکھا

غمِ دنیا، غمِ ہستی، غمِ جاناں، غمِ دل
کتنے ہی کانٹوں سے الجھا ہوا داماں دیکھا

ذرّے ذرّے سے ہویدا ہے ترے حُسن کی ضو
ایسے عالم میں جہاں عقل کو حیراں دیکھا

ڈال دی جس نے مہ و مہر پہ دانش کی کمند
ہم نے اے دورِ جنوں تیرا وہ انساں دیکھا

سب یہاں وحدتِ جلوہ کے پرستار ملے
تیری محفل میں نہ ہندو نہ مسلماں دیکھا

ہم نے اُن شوخ ہواؤں کی بلائیں لی ہیں
جن سے اکثر تری زلفوں کو پریشاں دیکھا

تیرے دیوانے نے ٹھکرا دیے دونوں عالم
اہلِ ظاہر نے اسے بے سرو ساماں دیکھا

اُس کو فرصت ہی کہاں حال پہ اوروں کے ہنسے
اپنے ہی حال پہ دیوانے کو خنداں دیکھا

آنکھ والوں کی شہادت بھی شہادت ہے کوئی
آنکھ والوں نے تجھے تا حدِ امکاں دیکھا

روح مضطر رہی جن میں، وہ ملے شیش محل[1]
روح کو امن ملا جس میں، وہ زنداں دیکھا

کٹ گئی عمر محبّت کے سفر میں لیکن
صبح کو شامِ تمنّا سے گریزاں دیکھا

بے کسی شامِ تمنّا کی نہ بھولے گی کبھی
اپنے سائے کو بھی اپنے سے گریزاں دیکھا

ایک درشن ہی ملا اوروں کا غم خوار ہمیں
اپنے غم میں تو زمانے کو پریشاں دیکھا

[1] تصوّف کا مسلک یہ ہے کہ ہم عیش و عشرت ترک کر کے محنت کی زندگی بسر کریں۔ میں نے عیش و عشرت کی زندگی کو "شیش محل" اور محنت کی زندگی کو "زنداں" سے تعبیر کیا ہے۔ یہ زنداں گھر کا، کنبے کا، سماجی پابندیوں کا، غمِ روزگار کا، یا کسی اور طرح کا ہو سکتا ہے۔ ہمارے بزرگوں نے یہی سکھایا ہے کہ عیش و عشرت کی زندگی کا ترک ایک عمل ہے، اور اس عمل سے ہی ہم انسانیت کی خدمت سرانجام دے سکتے ہیں۔

○

گر انھیں بزمِ جہاں میں نازِ یکتائی نہ ہو
اُن کو سونگوں میں شوقِ محفل آرائی نہ ہو

سرِ مرا خم اے خدا اُن کی ہی چوکھٹ پر رہے
اور در پر میری قسمت میں جبیں سائی نہ ہو

تم نہ ہو جو پاس تو ہو پاس یادوں کا ہجوم
ایسا عالم ہو کہ تنہائی بھی تنہائی نہ ہو

جب نگاہِ عشق پڑتی ہے ہزار انداز سے
حُسن کیوں ہر آن پھر محوِ خود آرائی نہ ہو

حُسنِ بے پردہ جو درشن آئے سیرِ باغ کو
نرگسِ بے نور بھی کیوں پھر تماشائی نہ ہو

○

○

عدوئے جاں بھی تمہیں ہو، تمہیں مسیحا بھی
عطا جو درد کیا ہے کرو مداوا بھی

پہنچ چکا ہوں خودی کی اک ایسی منزل پر
کہ ننگِ عزم ہے جس جا کوئی سہارا بھی

جو زندگی کے اندھیرے کو اک کرن بخشے
مرے لیے تو گراں ہے وہ اک اشارا بھی

کہاں سے دیکھتے ہم تیری بزم کا عالم
کہ تونے بھول کے ہم کو کبھی پُکارا بھی!

جسے مظالمِ قسمت کا نام دیتے ہیں
حرام مذہب عُشّاق میں وہ شکوا بھی

دیارِ عشق میں کیا امتیاز اے درشنؔ
یہاں سب ایک ہیں ادنیٰ بھی اور اعلیٰ بھی

○

منزل کہاں خیال کی، دیر و حرم کہاں
پہنچے تلاشِ یار میں اپنے قدم کہاں

ہاں میرے دردِ دل کا تقاضہ تو ہے مگر
دیکھوں میں اضطراب میں تجھ کو، یہ دم کہاں

زاہد یہ میرا دل ہے مگر خود سے بے نیاز
اس میں تو ہے جہان کا غم، اپنا غم کہاں

الفت تو اک خلوص کا سودا ہے اے ندیم
اس میں خیالِ کیفیتِ بیش و کم کہاں

عاشق کے دل میں دونوں جہاں آشکار ہیں
اس مرتبے کو پہونچا بھلا جامِ جم کہاں

اِک بے خودی سی کھینچ کے لاتی ہے ساقیا!
ورنہ شراب خانہ کہاں، اور ہم کہاں

درشن ہزار بارشِ رحمت کے باوجود
ہوتی ہے اپنی تشنگیٔ شوق کم کہاں

○

رازِ نہاں تھی زندگی، رازِ نہاں ہے آج بھی
وہم و گماں ازل میں تھی، وہم و گماں ہے آج بھی

کل بھی نوائے آگہی قیمتِ سنگ و خشت تھی
نغمۂ امن و آشتی، جنسِ گراں ہے آج بھی

دل سے تو روز و شب ہوئی لاکھ طرح کی گفتگو
تشنۂ گفتگو مگر اپنی زباں ہے آج بھی

خاک میں جذب ہو گیا تیرے شہید کا لہو
"مطلع کائنات پر سُرخ دھواں ہے آج بھی"

عشق کو نیند آ گئی، وقت پہ اوس پڑ گئی
اپنے جنوں کے دشت میں دھوپ جواں ہے آج بھی

وقت کی دسترس نہیں بزم گہِ خیال تک
رُخ پہ غبار ہی سہی، یاد جواں ہے آج بھی

کل بھی رُخِ حیات پر رنگِ شگفتگی نہ تھا
صبحِ بہارِ زندگی، شامِ خزاں ہے آج بھی

کل بھی زبان و نطق کو خوفِ سنان و سیف تھا
نقد و نظر کو دہشتِ تیر و کماں ہے آج بھی

در پئے تشنہ کام پر ایک نگاہ ساقیا!
شعلہ بیاں یہ کل بھی تھا، شعلہ بیاں ہے آج بھی

○

○

محبّت کی ہر چیز حُسن آفریں ہے
محبت کی دنیا سراسر حسیں ہے

ہے جنّت کی عظمت نگاہوں میں لیکن
وطن کی زمیں پھر وطن کی زمیں ہے

یہ گلشن، یہ رونق، یہ بادِ بہاری
اگر تو نہیں ہے تو کچھ بھی نہیں ہے

انھیں زیب دیتی ہیں منزل کی باتیں
جنھیں عزم و ہمت پہ اپنے یقیں ہے

کبھی یاد تیری کبھی تیرا جلوہ
کرم ہے یہ تیرا جو دل میں مکیں ہے

وفا دیر میرا، وفا میرا کعبہ
وفا میرا مذہب، وفا میرا دیں ہے

ضیافت سے شاہِ ستم گر کی بہتر
غریبانہ محنت کی نانِ جویں ہے

ملک جن پہ نازاں وہ انساں جہاں ہوں
ہمارے لیے تو وہ خلدِ بریں ہے

وہ عشقِ بُتاں میرا عین الیقیں تھا
یہ عشقِ خدا میرا حق الیقیں ہے

زمانے نے بدلے بہت رنگ لیکن
ترے در پہ درشنؔ کی اب بھی جبیں ہے

رقص کرتی ہے فضا، وجد میں جام آیا ہے
پھر کوئی لے کے بہاروں کا پیام آیا ہے

بادہ خوارانِ فنا! بڑھ کے قدم لو اُس کے
لے کے ساغر میں جو صہبائے دوام آیا ہے

میں نے سیکھا ہے زمانے سے محبّت کرنا
تیرا پیغامِ محبّت مرے کام آیا ہے

رہبرِ جادۂ حق، نورِ خدا، ہادیِ دیں
لے کے خالق کا زمانے میں پیام آیا ہے

تیری منزل ہے بلند اتنی کہ ہر شام و سحر
چاند سورج سے ترے در کو سلام آیا ہے

ہو گیا تیری محبّت میں گرفتار تو پھر
طائرِ روح بھلا کب تہِ دام آیا ہے

خود بخود جھک گئی پیشانیِ اربابِ خودی
عشق کی راہ میں ایسا بھی مقام آیا ہے

عاصیو! شکر کی جا ہے کہ بہ فیضِ خالق
ہم گنہگاروں کی بخشش کا پیام آیا ہے

حرم و دیر کے لوگوں کی خوشی کیا کہنا
بندہ خالق و دلدادۂ رام آیا ہے

تشنہ کامانِ نظارہ کو یہ مژدہ دے دو
بے نقاب آج کوئی پھر سرِ بام آیا ہے

ہو مبارک تمہیں رندو! کہ بہ تائیدِ خدا
کوئی چھلکتا ہوا شیشہ و جام آیا ہے

جب کبھی گردشِ دوراں نے ستایا ہے بہت
تیرے رندوں کی زباں پر ترا نام آیا ہے

اہلِ مغرب کو پلا کر مئے عرفاں درشنؔ
پھر سے مشرق کی طرف عرش مقام آیا ہے

○

○

ہم اپنے حرفِ شکایت پہ شرمسار آئے
کہ اُن کے آئینۂ دل پہ کیوں غبار آئے

جھُکی جھُکی سی یہ نظریں، یہ دل نشیں چہرہ
تمہیں کہو تمہیں دیکھیں تو کیوں نہ پیار آئے

تمام زندگیٔ آرزو کا حاصِل تھی
وہ ایک شب جو تیری بزم میں گزار آئے

جن اہلِ زُہد کو دعویٰ تھا پارسائی کا
تری گلی سے وہ آئے تو شرمسار آئے

چمن کے حُسن کی خاطر ہے آرزو درشن
جسے نہ خوفِ خزاں کا ہو وہ بہار آئے

○

○

محفل میں محبّت کی نظر ڈھونڈ رہے ہیں
ہم شامِ تمنّا کی سحر ڈھونڈ رہے ہیں

بے وجہ نہیں دشتِ محبّت میں تجسّس
جینے کے لئے راہ گزر ڈھونڈ رہے ہیں

کچھ لطفِ عبادت نہ ملا دیر و حرم میں
سجدے کے لئے پھر کوئی در ڈھونڈ رہے ہیں

درکار ہے احساسِ وفا، دردِ رفاقت
اسبابِ سفر بہرِ سفر ڈھونڈ رہے ہیں

ہم اہلِ جُنوں ہیں ابدی عشق کے طالب
جو آکے نہ جائے وہ سحر ڈھونڈ رہے ہیں

ہوتی ہوں جہاں امن و مروّت کی ہی باتیں
ہم ایسا محبّت کا نگر ڈھونڈ رہے ہیں

اپنی تو نگاہوں میں ہیں گل ہائے بہاراں
وہ اور ہیں جو برق و شرر ڈھونڈ رہے ہیں

ہم منزلِ الفت کے لئے آبلہ پا ہیں
ہم صبحِ تمنّائے بشر ڈھونڈ رہے ہیں

گھبرائے ہیں جو تیرگیِ وقت سے درشن
ہر صبح و مسا شمس و قمر ڈھونڈ رہے ہیں

○

○

دولت ملی جہان کی، نام و نشاں ملے
سب کچھ ملا ہمیں نہ مگر مہرباں ملے

پہلے بھی جیسے دیکھ چکے ہوں انہیں کہیں
انجان وادیوں میں کچھ ایسے نشاں ملے

بڑھتا گیا میں منزلِ محبوب کی طرف
حائل اگرچہ راہ میں سنگِ گراں ملے

رونا پڑا نصیب کے ہاتھوں ہزار بار
اک بار مسکرا کے جو تم مہرباں ملے

ہم کو خوشی ملی بھی تو بس عارضی ملی
لیکن جو غم ملے وہ غمِ جاوداں ملے

باقی رہے گی حشر تک اُن کے کرم کی یاد
مجھ کو رہِ حیات میں جو مہرباں ملے

پھر کیوں کرے تلاش کوئی اور آستاں
وہ خوش نصیب جس کو ترا آستاں ملے

اہلِ ستم کی دل شکنی کا سبب ہوا
دل کا یہ حوصلہ کہ غمِ بیکراں ملے

ساقی کی اک نگاہ سے کایا پلٹ گئی
زاہد جو میکدے میں ملے نوجواں ملے

دیر و حرم کے لوگ بھی درماں نہ کر سکے
وہ بھی اسیرِ کشمکشِ این و آں ملے

نظریں تلاش کرتی رہیں جن کو عمر بھر
درشن کو وہ سکون کے لمحے کہاں ملے

○

باتیں خود اپنے دل سے کیے جا رہا ہوں میں
تنہائی کو فریب دیے جا رہا ہوں میں

اب اُن کا غم بھی وجہِ تسلّی نہیں رہا
یہ غم بھی اپنے ساتھ لیے جا رہا ہوں میں

جس رہ گزر سے گزرا ہے اُن کا خیال بھی
اس رہ گزر پہ سجدے کیے جا رہا ہوں میں

بے خوف گزریں راہ سے اب اہلِ کارواں
کانٹوں کو اپنے ساتھ لیے جا رہا ہوں میں

درشنؔ اب اپنے پاس ہے کیا جُز غمِ فراق
اِک دل تھا وہ بھی اُن کو دیے جا رہا ہوں میں

○

ہر گھڑی ماتم تو ہر لمحہ غمِ ایّام ہے
زندگی ہے یا ہمارے سر کوئی الزام ہے

جزو سے کُل کی طرف جن کا سفر ہے روز و شب
موت اُن کی منزلِ مقصود کا اک نام ہے

حادثاتِ زندگی سے ڈرنے والے اور ہیں
میرا ساغر تو جوابِ گردشِ ایّام ہے

عِشق کا عالم تغیّر آشنا ہوتا نہیں
صبح ہے اب اپنی دنیا میں نہ کوئی شام ہے

آمد و شُد کو نفس کی زندگی کیونکر کہیں
زندگانی تو شعورِ زندگی کا نام ہے

اے شبابِ عہدِ نو! پیرانہ سالی کی جھلک!!
کیوں چراغِ صبح کی صورت چراغِ شام ہے

ساقیا! کیوں تجھ سے مانگیں ہم دوائے تشنگی
پیاس کی لذّت ہی درشن پیاس کا انعام ہے

○

بہار بھیگنے لگتی ہے، رات ڈھلتی ہے
تو اُن کی یاد بہت کروٹیں بدلتی ہے

جو تیرے مست کی حالت کبھی سنبھلتی ہے
حیات ساغرِ غم لے کے آ نکلتی ہے

نگاہِ شوق کی بیتابیوں پہ کیوں الزام
شراب شیشۂ رنگیں میں خود مچلتی ہے

تمہاری یاد نے بیگانہ کر دیا خود سے
کہیں بھی جاؤں طبیعت نہیں بہلتی ہے

بہار سیر کے قابل تو ہے مگر ہمدم
ہر ایک پھول سے اک آنچ سی نکلتی ہے

ترے فراق میں جینا ہے ناگوار اتنا
نفس نفس کوئی تلوار جیسے چلتی ہے

غمِ وفا سے گدازِ حیات ہے درشنؔ
یہ شمع اپنی حرارت سے خود پگھلتی ہے

○

شبِ غم خواب سے آنکھوں کو آلودہ نہیں کرتے
ہم اپنے جذبۂ بیدار کو رسوا نہیں کرتے

رقیبِ فتنہ جو تک اے صبا یہ بات پہنچا دے
کہ ہم اہلِ دیارِ امن ہیں جھگڑا نہیں کرتے

ق

مگر جب آنچ آجائے ہماری دردمندی پر
تو ہم اہلِ خودی غیرت کا پھر سودا نہیں کرتے

غمِ دنیا، غمِ ہستی، غمِ جاناں، غمِ دوراں
وہ طوفاں کونسا ہے جس سے ہم کھیلا نہیں کرتے

کچھ آداب نظارہ بھی ہیں اے بیتابِ نظارہ
بھری محفل میں یوں اُن کی طرف دیکھا نہیں کرتے

مثالِ شمع جل جاتے ہیں سوزِ غم میں دل والے
مگر شکوہ نہیں کرتے، مگر شکوہ نہیں کرتے

قدم جب راہِ الفت میں اُٹھا لیتے ہیں دیوانے
تو پھر آندھی ہو یا طوفان وہ پروا نہیں کرتے

جنہیں کچھ پاسِ ناموسِ وفا ہوتا ہے اے ہمدم
وہ آنسو آنکھ تک آتے ہیں پر ٹپکا نہیں کرتے

غمِ دوراں کی کچھ پرچھائیاں ملتی نہ ہوں جس میں
وہ افسانہ ہم اے درشنؔ کبھی لکھا نہیں کرتے

○

○

کہیں جمالِ ازل ہم کو رو نما نہ ملا
ملے حسین مگر کوئی آپ سا نہ ملا

رہی تلاش مگر درد آشنا نہ ملا
ہمارے بعد انہیں ہم سا باوفا نہ ملا

گئے ہیں دیر و حرم میں بھی بار ہا لیکن
وہ آسرا جو دیا تو نے ساقیا! نہ ملا

جو دور تھے تو بہت پارسا تھے یہ زاہد
جو پاس آئے تو کوئی بھی پارسا نہ ملا

مقابلہ کیا طوفاں کا آخری دم تک
خدا کا شکر ہے کشتی کو ناخدا نہ ملا

جوابِ جنّتِ رنگیں سہی تری دنیا
مگر سکون یہاں ہم کو اے خدا نہ ملا

ہوا و حرص کے لاکھوں شکار پائے مگر
کوئی بھی دردِ محبّت میں مبتلا نہ ملا

جو چشمِ مست سے چھلکا کے دے الست کی مے
ترے سوا کوئی دنیا میں ساقیا نہ ملا

مجھی کو بخش دیے کل جہان کے آلام
غمِ جہاں کے لیے کوئی دوسرا نہ ملا

کہوں تو کس سے کہوں دل کی بات اے درشن
سُنے جو دردِ بشر ایسا ہم نوا نہ ملا

○

کس کا در ہے کہ جبیں آپ جُھکی جاتی ہے
دلِ خود دار! تیری آن مٹی جاتی ہے

آرزو دل کی جوانی میں مٹی جاتی ہے
ہائے کیا شمع سرِ شام بجھی جاتی ہے

تم جو آنکھوں سے پلاؤ تو بجھے کچھ پیاس
جام و مینا سے کہیں تشنہ لبی جاتی ہے

جانے کیوں دیکھ کے اے جانِ بہاراں تجھ کو
خود بخود دل کی کلی آج کھِلی جاتی ہے

ڈبڈبائی ہوئی آنکھیں مری دیکھ اے ساقی
تیرے میخانے میں اس طرح بھی پی جاتی ہے

تم مرے شکوۂ اخلاص پہ کیوں روٹھ گئے
بات کہنے کی جو ہوتی ہے کہی جاتی ہے

پھول کھِلتا ہے گلستاں میں تو آتی ہے صدا
زندگی موت سے نزدیک ہوئی جاتی ہے

ناگوارا ہے بہت شورشِ نغماتِ خِرد
جس میں انسان کی آواز دبی جاتی ہے

سوئے میخانہ ذرا تیز قدم اے درشن
تیرے حصّے کی بھی غیروں میں بٹی جاتی ہے

○

چشمِ بینا ہو تو قیدِ حرم و طور نہیں
دیکھنے والی نگاہوں سے وہ مستور نہیں

کون سا گھر ہے جو ان جلووں سے پُر نور نہیں
اک مرے دل کی ہی دنیا ہے جو معمور نہیں

اپنی ہمت ہی سے پہنچوں گا سرِ منزلِ شوق
لوں سہارا میں کسی کا مجھے منظور نہیں

یہ محبّت کی ہے قیمت، یہ محبت کا صلہ
اب ہمارے ہی لیے عشق کا دستور نہیں

دونوں عالم کو ڈبو دے جو مے و مینا میں
چشمِ ساقی کے سوا اور کا مقدور نہیں

مُسکرا دو تو مرا غنچۂ دل کھِل جائے
دل کبھی کھِل نہ سکے ایسا بھی رنجور نہیں

تم نہیں پاس مگر ساتھ ہے یادوں کا ہجوم
میں اکیلا نہیں، بے کس نہیں، مجبور نہیں

آج کچھ شام سے تاریک ہے دل کی محفل
تم نہیں ہو تو وہ رونق نہیں، وہ نور نہیں

مجھ میں ہمت ہے کہ میں راز کو افشا نہ کروں
یہ مرا ظرف ہے، یہ شیوۂ منصور نہیں

کر سکے گا نہ جدا فاصلۂ وقت و مکاں
دور نظروں سے سہی دل سے مگر دور نہیں

میری تقدیر میں درشن ہیں کسی کے جلوے
شکر صد شکر کہ دنیا مری بے نور نہیں

○

خُم کے خُم نرگسی آنکھوں سے لنڈھا دے ساقی
آج متوالوں کو جی بھر کے پلا دے ساقی

بادۂ صاف سے دل صاف ہوا ہے میرا
اب مجھے راز دو عالم کا بتا دے ساقی

جانِ میخانہ! تجھے مست نگاہی کی قسم
رنج و غم سے مجھے بیگانہ بنا دے ساقی

تیری نظروں کی ہے قیمت دل و ایماں ہی اگر
تیری نظروں پہ نچھاور ہیں، پلا دے ساقی

تیرے درشن کے لیے آیا ہے درشن تیرا
مستِ دیدار ذرا اُس کو پلا دے ساقی

○

حیات کو دلِ سوزاں کی روشنی تو ملی
چمن کو گریۂ شبنم سے تازگی تو ملی

پہنچ گئے جو سرِ دار وہ مبارک ہیں
شہید ہو کے ہمیشہ کی زندگی تو ملی

حضورِ دوست خودی کا نشان تک نہ ملا
مگر خودی مری خوش ہے کہ بیخودی تو ملی

ہوا جو خونِ تمنّائے دل تو کیا غم ہے؟
میں شاد ہوں کہ اُسے شانِ دلبری تو ملی

ہمیں تو مذہبِ انسانیت پسند آیا
کہ آدمی کو یہاں روحِ بندگی تو ملی

گزر کے دیر و حرم سے دیارِ دل میں آئے
خوشی یہ ہے کہ یہاں غم کی روشنی تو ملی

بھلا ہو اُس کا کہ توڑا ہے جس نے دل درشنؔ
غمِ حیات سے تہذیبِ شاعری تو ملی

○

راز یہ مجھ پہ آشکارا ہے
عشق شبنم نہیں شرارا ہے

اک نگاہِ کرم، پھر اس کے بعد
عمر بھر کا ستم گوارا ہے

رقص میں ہیں جو ساغر و مینا
کس کی نظروں کا یہ اشارا ہے

ایسی منزل پہ آ گیا ہوں جہاں
ترے غم کا ہی اِک سہارا ہے

لوٹ آئے ہیں یار کے در سے
وقت نے جب ہمیں پکارا ہے

دل نہ ٹوٹے تو ذرّہ ناچیز
کیمیا ہے جو پارا پارا ہے

جامِ رنگیں میں اُن کا عکسِ جمال
یا شفق میں کوئی ستارا ہے

ناؤ ٹکرا چکی ہے طوفاں سے
اب تو مرشد کا ہی سہارا ہے

عشق کرنا ہے مات کھا جانا
اِس میں جیتا ہوا بھی ہارا ہے

اپنے درشن پہ اک نگاہِ کرم
وہ غمِ زندگی کا مارا ہے

○

محبّت رونقِ دنیائے سوز و ساز ہوتی ہے
محبّت دو دلوں کی ایک ہی آواز ہوتی ہے

جنونِ زندگی میں جو خرد کو منتقل کر دے
وہی تو مردِ مومن کی نگاہِ ناز ہوتی ہے

ترستی ہے تری آہٹ کو میری صبحِ تنہائی
شبِ غم کی اُداسی گوش برآواز ہوتی ہے

محبّت وہ نہیں چرچا ہو جس کا اہلِ محفل میں
محبّت راز ہوتی ہے سراپا راز ہوتی ہے

مری بیتاب نظروں کو نہیں ہے تابِ گستاخی
جو شہ دیتی ہے وہ ان کی نگاہِ ناز ہوتی ہے

محبّت ہے متاعِ جاودانی جلنسِ لا ہوتی
محبّت کرنے والوں کی بڑی پرواز ہوتی ہے

خموشی تو چھپا لیتی ہے رازِ دل، مگر درشن
یہ چشمِ ترکی بیتابی بڑی غمّاز ہوتی ہے

○

○

جلوہ افگن جو کوئی آج سرِ بام نہیں
روشنی کا مری دنیا میں کہیں نام نہیں

روک سکتے نہیں طوفانِ حوادث مجھ کو
عزم پختہ ہے مرا عشق مرا خام نہیں

ہو گئی یاد تری وقت و مکاں سے آزاد
تو نگاہوں میں ہے اب صبح نہیں شام نہیں

مجھ پہ طاری ہے عجب کرب کا عالم اے دوست
دل کو تسکین نہیں، روح کو آرام نہیں

چشمِ عاشق کا کرشمہ تو ہیں رنگیں جلوے
عشق گر دل میں نہیں حُسن بھی گلفام نہیں

چشمِ ساقی سے چھلکتی ہوئی مستی کے نثار
نہ سہی گر مری محفل میں کوئی جام نہیں

بندگی اُن کی حقیقت میں ہے ہستی درشنؔ
رائیگاں زیست، جو بندوں میں ترا نام نہیں

○

صہبائے جم نہ ساغرِ شاہانہ چاہیے
میرے لئے خلوص کا پیمانہ چاہیے

آساں ہیں شمعِ دیر و حرم سے تعلّقات
لیکن دلوں میں جذبۂ پروانہ چاہیے

ہر لفظ پر ملے گی سزائے صلیب و دار
سچ بولنے کو ہمّت مردانہ چاہیے

کعبہ ہو اُس کا نام کہ کاشی ہو دوستو
ہم کو تو اپنے دوست کا کاشانہ چاہیے

مشکل نہیں ہے دیر و حرم میں مفاہمت
لیکن فضائے محفلِ میخانہ چاہیے

انصاف میکدے میں ضروری ہے ساقیا
ہر تشنہ لب کے واسطے پیمانہ چاہیے

دیر و حرم کی قید سے کچھ واسطہ نہیں
درشن ہمیں تو جلوۂ جانانہ چاہیے

○

○

یہ کس نے کہہ دیا آخر کہ چھپ چھپا کے پیو
یہ مے ہے مے اسے اوروں کو بھی پلا کے پیو

غمِ جہاں کو، غمِ زیست کو بھلا کے پیو
حسین گیت محبّت کے گنگنا کے پیو

چھٹے نہ دامنِ طاعت بھی وقتِ مے نوشی
پیو تو سجدۂ اُلفت میں سر جھکا کے پیو

مُجھے تجھے سے ہوں ارماں تو کیا فروغِ نشاط
جو سو گئے ہیں ستارے اُنہیں جگا کے پیو

غمِ حیات کا درماں ہیں عشق کے آنسو
اندھیری رات ہے یارو! دیے جلا کے پیو

نصیب ہوگی بہر کیف مرضیٔ ساقی
ملے جو زہر بھی یارو تو مسکرا کے پیو

مرے خلوص پہ شیخِ حرم بھی کہہ اُٹھا
جو پی رہے ہو تو درشن حرم میں آ کے پیو

کیا خبر کون سے عالم میں ملی اُن سے نظر
ہوش دامن کا رہا اور نہ گریباں کی خبر

دام رنگیں ہیں ترے واسطے یہ شمس و قمر
ان میں رہ جائے اُلجھ کر نہ کہیں تیری نظر

آج کیا روٹھ گیا جانِ بہارِ منزل!
سونی سونی سی نظر آتی ہے کیوں راہ گزر

رندِ بے باک! ذرا شیشہ و مینا کا لحاظ
دل کی دنیا سے گزرنا ہے تو آہستہ گزر

گریۂ شامِ الم میرے جنوں سے پوچھو
سائے سائے سے لپٹتا رہا با دیدۂ تر

کوئی سالک ہے نہ مسلک بجز ایمائے سلوک
دل ہی کھینچے لیے جاتا ہے سرِ راہ گزر

ساتھیو! پھر سے اندھیرے کو نہ آنے دینا
کتنے پہنچے ہیں سرِ دار تو دیکھی ہے سحر

خود کرے حُسن تقاضائے نظر لطف ہے جب
منتظر ہی نہ ہو کوئی تو اُٹھے کیسے نظر

زندگی خواب و حقیقت کا ہے سنگم درشن
درحقیقت یہی سنگم تو ہے معراجِ بشر

غمِ حیات پہ خنداں ہیں تیرے دیوانے
عجیب صاحبِ عرفاں ہیں تیرے دیوانے

ہر ایک ذرّہٗ صحرا ہے، آئینہ خانہ
ہجومِ جلوہ سے حیراں ہیں تیرے دیوانے

کہاں یہ ہوش کہ اوروں کی زندگی پہ ہنسیں
خود اپنے حال پہ خنداں ہیں تیرے دیوانے

ہجومِ اشک میں چھلکا رہے ہیں پیمانہ
حریفِ گردشِ دوراں ہیں تیرے دیوانے

بہار آتے ہی کیا جانے اُن پہ کیا گزری
کہ خود سے دست و گریباں ہیں تیرے دیوانے

کبھی تو اک نگہِ جاں نواز ہو جائے
ہنوز کشتۂ ارماں ہیں تیرے دیوانے

نشاط و درد میں دیکھا ہے میں نے درشنؔ کو
ہر ایک حال میں شاداں ہیں تیرے دیوانے

○

قیدِ غمِ حیات سے اہلِ جہاں مفر نہیں
ایسی بلا ہے شامِ غم جس کی کوئی سحر نہیں

ہے وہ سفر جو عشق کو جانبِ دوست لے چلے
ورنہ سفر کے واسطے کون سی رہ گزر نہیں

اہلِ خرد کو چاہیے دل کے نگر میں آ بسیں
دِل سا حسین و خوشنما اور کوئی نگر نہیں

تیرے کرم پہ ہے یقیں گرچہ یہ جانتا ہوں میں
نالہ ہے میرا نارسا، آہ میں کچھ اثر نہیں

حسرتِ انتظار کی بات نہ ہم سے پوچھیے
ہے یہ طویل داستاں، قصۂ مختصر نہیں

لٹ تو گئے ہیں دل مگر لٹ بھی گئی ہیں منزلیں
رہ گزرِ حیات میں عشق سا راہبر نہیں

اپنا رہا نہ ہوش جب رازِ حیات پا لیا
نعمتِ بےخودی سمجھ، ہوش کا یہ ثمر نہیں

عشق متاعِ لامکاں، عشق متاعِ جاوداں
شعلۂ دائمی ہے یہ، منظرِ یک شرر نہیں

درشنِ مست سے ملیں، کھولے گا رازِ آگہی
گرچہ وہاں ہے جس جگہ اپنی اُسے خبر نہیں

○

تجھے کیا خبر مرے ہم سفر، مرا مرحلہ کوئی اور ہے
مجھے منزلوں سے گریز ہے، میرا راستہ کوئی اور ہے

میری چاہتوں کو نہ پوچھیے، جو ملا طلب سے سوا ملا
میری داستاں ہی عجیب ہے، مرا مسئلہ کوئی اور ہے

یہ ہوس کے بندے ہیں ناصحا، نہ سمجھ سکے مرا مدّعا
مجھے پیار ہے کسی اور سے، مرا دلربا کوئی اور ہے

مرا ذوقِ سجدہ ہے ظاہری کہ ہے کشمکش مری زندگی
یہ گمان دل میں رہا سدا، مرا مدعا کوئی اور ہے

وہ رحیم ہے، وہ کریم ہے، وہ نہیں کہ ظلم کرے سدا
ہے یقیں زمانے کو دیکھ کر، کہ یہاں خدا کوئی اور ہے

میں چلا کہاں سے خبر نہیں کہ سفر میں ہے مری زندگی
مری ابتدا کہیں اور ہے، مری انتہا کوئی اور ہے

مرا نام درشنؔ خستہ تن، مرے دل میں کوئی ہے ضو فگن
میں ہوں گم کسی کی تلاش میں، مجھے ڈھونڈتا کوئی اور ہے

○

○

اس راہ میں آتے ہیں بیاباں بھی، چمن بھی
کہتے ہیں جسے زیست، شبستاں بھی ہے رن بھی

کیا ہو گیا انسان کا وہ شوقِ شہادت
ویران نظر آتے ہیں اب دار و رسن بھی

بجھ جائے گی مل جل کے اگر پیاس بجھاؤ
گنگا ہی کے نزدیک تو ہے رودِ جمن بھی

اب لالہ بداماں نہ کوئی چاک گریباں
ویران چمن ہی نہیں، سنسان ہے بن بھی

اک ہم ہی نہیں آبلہ پا دشت و دمن میں
آتے ہیں نظر خاک بسر لالہ بدن بھی

خالی نہیں اب دامنِ حسرت مرادِ زشتن
ہمراہِ وفا مجھکو مِلا عشقِ وطن بھی

پلٹ کے آئی مناظر سے ہر نظر تنہا
رہا جہانِ تماشا میں دیدہ ور تنہا

کہاں نصیب نئے دور میں دلوں کا ملاپ
ملا ہجومِ بشر میں ہر اک بشر تنہا

تیرے خیال نے بخشی ہیں قربتیں کیا کیا
ہماری شام ہی تنہا، نہ اب سحر تنہا

غمِ وفا، غمِ ہستی، غمِ جہاں، غمِ دوست
بہ قیدِ ہوش تو رہتا نہیں بشر تنہا

بچھڑتے جاتے ہیں راہی ہر ایک منزل پر
یہ خوف ہے کہ نہ رہ جائے راہبر تنہا

نظر جب اُن سے ملی، پھول کھِل گئے ہر سو
خزاں رسیدہ تھی جب تک رہی نظر تنہا

نہ ہم سفر، نہ کوئی راہبر ملا درشن
کیا ہے معرکۂ زیست ہم نے سر تنہا

میں اکیلا تو نہیں، ذوقِ جنوں ہے ہم سفر
ظلمتِ شب کے بھنور سے لاؤں گا نورِ سحر

بچ گیا میں رہزنوں سے، ایسا لگتا ہے مگر
دور منزل سے لیے جاتے ہیں مجھ کو راہبر

جام میں پڑ جاتے گر عکسِ خیالِ حُسنِ یار
نشۂ مے ہو جمالِ ضو فگن سے تیز تر

ناگوارا ہے تجھے ہر لغزشِ بیجا مری
اور سجا دی ہے گناہوں نے مری ہر رہ گزر!!

وعدۂ فردا کا اُن کے کر نہ پایا انتظار
زندگی مجھ کو عطا کی اور اتنی مختصر!!

اُٹھ رہا ہے اب زمانے سے محبّت کا چلن
ہونے والا ہے جہانِ رنگ و بُو زیر و زبر

جتنا ہوں مشتاقِ درشن، اتنے ہی بیزار وہ
نارسا میری دعائیں، میرے نالے بے اثر

○

غمِ حیات ہے دل کو نہ فکرِ دنیا ہے
تمھارا درد تو ہر درد کا مداوا ہے

کہاں جھکاؤں میں سر کو کدھر ہے در تیرا
یہ دیر ہے، یہ حرم اور وہ کلیسا ہے

کوئی بھی منکرِ منزل نہیں ملا لیکن
کسی نے یہ نہ بتایا کہ راستہ کیا ہے

مرے چمن میں خراماں نہیں نسیمِ بہار
جنوں کے نام کسی نے پیام بھیجا ہے

نیا نہیں ہے طلسمِ حیات میرے لیے
"یہ خواب وہ ہے جسے بار بار دیکھا ہے"

نہ جانے گردشِ ایّام کب موافق ہو
جبیں کو رکھ دے سرِ راہ، دیکھتا کیا ہے!

ہمارے دل کا بھی درماں ہوا ہے غمِ جاناں
کہ زخم خوردۂ حسنِ ادائے دنیا ہے

دماغ و دل میں شگوفے سے کھلنے لگتے ہیں
میرے چمن کی ہوا کتنی فرحت افزا ہے

خبر نہیں ابھی قطروں کو اپنی وُسعت کی
ہر ایک قطرے میں پوشیدہ ایک دریا ہے

نگاہِ شوق جو ڈالی تو یہ کھُلا ہم پر
کہ ذرّے ذرّے کے سینے میں ایک صحرا ہے

ترے وجود سے انکار کس طرح کردوں
ترا جمال تو ہر شے میں کار فرما ہے

کہوں بھی کیا میں عزیزانِ دشمنِ جاں کو
مرا لہو ہے جو میرے لہو کا پیاسا ہے

ہجومِ ظلمتِ غم کا ہراس کیا درشن
کہ میرے دل میں سدا اک دِیا سا جلتا ہے

○

گنگناتی ہے ہوا، پھول کِھلے، دیپ جلے
ہنس پڑی رات مہکتے ہوئے آنچل کے تلے

یوں تمنّائیں چمک اُٹھتی ہیں دل میں جیسے
چہرۂ وقت پہ رہ رہ کے کوئی ہاتھ ملے

بچ کے تاروں کی نگاہوں سے گلوں سے چُھپ کر
دو نگاہوں کی مُلاقات ہوئی رات ڈھلے

رنگ و خوشبو سے چھلکنے لگا میخانۂ دل
ساقیا! جام چلے، جام چلے، جام چلے

آج درشن نئے انداز سے ہے گرمِ نوا
اُس کی آواز سے نغموں کے نئے دیپ جلے

ہے شرط دل سے دل ملے اور جاں سے جاں ملے
اکثر ملے وہ راہ میں، لیکن کہاں ملے

پروانہ چپ تھا شمع کے منہ میں زباں نہ تھی
محفل میں ایک دو ہی مجھے راز داں ملے

حرفِ جنوں خطا ہے جہاں ذکرِ عشق جرم
دیکھو تو اتفاق سے ہم تم کہاں ملے

دیر و حرم میں ڈھونڈ کے ہم تھک گئے ندیم
ہندو یہاں ملے نہ مسلماں وہاں ملے

دنیا کے سارے درد کا درماں ہے اک نگاہ
لیکن وہ اک نگاہِ محبّت کہاں ملے!

یوں چل رہِ وفا میں کہ چلنا ہو یادگار
ہر موڑ پر حیات کے تیرا نشاں ملے

درشنؔ یہ آرزو ہے کہ جب میرا ذکر ہو
قصّوں سے اہلِ دل کے مری داستاں ملے

○

غمِ انساں ہو عیاں آپ کے شہ پاروں سے
ہے گذارش یہ مری آج کے فنکاروں سے

ارتقا کے یہ مخالف ہیں، جنوں کے دشمن
"کیا کہیں رسم و روایت کے پرستاروں سے"

دونوں عالم سے ہیں آزاد یہ غم کے مارے
کیا کہیں گیسوے جاناں کے گرفتاروں سے

تن کے اُجلے ہیں مگر من کے بہت کالے ہیں
ہم گنہگار کہیں اچھے ہیں دین داروں سے

صحنِ گلشن میں لہو چھڑکا ہے دیوانوں نے
بوئے خوں آتی ہے اس فصل میں گلزاروں سے

شیش محلوں کی فضاؤں میں تو گم ہیں وہ بھی
نورِ عرفاں کی کرن ہم کو ملی غاروں سے

ہنستے ہنستے وہ سرِ دار بھی پہنچے درشن
اور امید تھی کیا اپنے وفاداروں سے

○

○

دکھا شانِ مسیحائی کہ اب لب پر مری جاں ہے
ترے دامانِ رحمت میں دوائے دردِ انساں ہے

مئے توحید سے مخمور ہونا اصلِ ایماں ہے
یہ وہ مے ہے کہ طالب جس کا ہر ہندو مسلماں ہے

ہے پُر خار و خطر وادی محبت کی، مگر اے دل!
رسائی ہوگی منزل تک، گورو میرا نگہباں ہے

بتا دے "موت[1] سے مرنے سے پہلے" راز اے محرم
تو رازِ "کُن فکاں" کر آشکارا جو کہ پنہاں ہے

حضورِ حُسن مطرب چھیڑ دے بے ساز اک نغمہ
ترے دل کی ہر اک دھڑکن سراپا نغمہ ساماں ہے

نہ گھبرا عشق کی پر پیچ راہوں سے تو اے درشن
پکارے گی تجھے منزل، جنوں تیرا نگہباں ہے

○

---

[1] مُوتُوا قبل اَن تمُوتُوا

ہے شعلۂ رُخ تیرا یا جلوۂ زیبائی
یہ عالمِ امکاں ہے تیرا ہی تماشائی

اندازِ تکلّم ہے یا نغمۂ روحانی
سو جان سے قرباں ہیں جس پر ترے شیدائی

ساقی کے اشاروں پر مخمور ہیں دیوانے
کتنی ہے کشش اس میں کس درجہ ہے رعنائی

کیا ذکر مرا ساقی میں تو ہوں ترا بندہ
جس نے بھی تجھے دیکھا، تیرا ہوا شیدائی

پھر یاد تری آئی اے جانِ جہاں ساقی
"پھر ذوقِ تماشا نے لی جھوم کے انگڑائی"

ہر دم تیرے جلووں سے سرشار رہے درشن
ہو سر میں ترا سودا، اور شغلِ جبیں سائی

○

ہیں اور وہ اپنوں سے جو کترا کے چلے ہیں
ہم وہ ہیں جو غیروں کو بھی اپنا کے چلے ہیں

اُلجھے ہی نہیں گیسوئے پُرخم میں کسی کے
ہم وقت کی زُلفوں کو بھی سلجھا کے چلے ہیں

ہنگامِ سفر دید کے قابل تھا نظارہ
خود تڑپے ہیں اوروں کو بھی تڑپا کے چلے ہیں

ہر موڑ پہ منزل کا گماں مجھ کو ہوا ہے
جب قافلے کچھ میری تمنّا کے چلے ہیں

جیسے کہ چلیں جانبِ میخانہ شرابی
عاشق ترے یوں دار پہ لہرا کے چلے ہیں

امّید تھی جن سے کہ بجھائیں گے مری پیاس
وہ اور بھی کچھ پیاس کو بھڑکا کے چلے ہیں

اٹھّے ہیں درِ ساقیِ الفت سے جو درشن
محسوس یہ ہوتا ہے کہ کچھ پا کے چلے ہیں

آج دل سے دعا کرے کوئی
حقِّ اُلفت ادا کرے کوئی

جس طرح دل مرا تڑپتا ہے
یوں نہ تڑپے خدا کرے کوئی

جان و دل ہم نے کر دیے قرباں
وہ نہ مانے تو کیا کرے کوئی

دلِ بیتاب کی تمنا ہے
پھر کہوں میں، سنا کرے کوئی

مست نظروں سے خود مرا ساقی
پھر پلائے، پیا کرے کوئی

مئے عرفاں کے ہم بھی ہیں مشتاق
درِ میخانہ وا کرے کوئی

شوقِ دیدار دل میں ہے درشن
آ بھی جائے خدا کرے کوئی

راہ گُم کردہ کوئی جب سرِ منزل آیا
خوش ہوئے لوگ کہ لو ہوش میں غافل آیا

رُخ سے اُٹھی جو نقاب اُس کے ہوا سب کو گماں
جلوۂ طور لیے وہ سرِ محفل آیا

دل دھڑکنے لگا طوفان کی موجوں میں کہ جب
ناامیدی میں نظر سامنے ساحل آیا

جھٹپٹے وقت سرِ بام وہ آئے جو نظر
ہوا محسوس، فلک پر مہِ کامل آیا

بد حواسی نے عیاں کردیا اس کا ہر جُرم
پا بجولاں جو سرِ حشر وہ قاتل آیا

جستجو چار طرف ہونے لگی درشن کی
قافلہ جب کوئی چل کر سرِ منزل آیا

○

مرگِ زندہ دلاں قیامت ہے
پھول نذرِ خزاں! قیامت ہے

سُن سکے گا کوئی زمانے میں
ہجر کی داستاں قیامت ہے

راہبر کی ذرا سی غفلت سے
لُٹ گیا کارواں، قیامت ہے

کر دیا اپنے آشیانے کو
نذرِ برقِ تپاں، قیامت ہے

کیسے لائیں گے تاب اہلِ دل!
شورِ آہ و فغاں قیامت ہے

ایک مُبہم اُمیدِ جنّت پر
ترکِ عشقِ بُتاں، قیامت ہے

میکدے میں بنے ہیں اب درشن
آپ پیرِ مُغاں! قیامت ہے

○

○

کہوں کیسے، کیا اے خدا چاہتا ہوں!
کرم کی تیرے انتہا چاہتا ہوں

خودی کو مٹا کر خدا چاہتا ہوں
جنوں سا کوئی رہنما چاہتا ہوں

جو بخشے مجھے جاوداں زندگانی
اک ایسی نظر جاں فزا چاہتا ہوں

ازل سے ہوں تیرے ہی در کا بھکاری
میں اوروں سے بھی کچھ سوا چاہتا ہوں

بیاں حالِ دل میں کروں کیا زباں سے
کہ تو جانتا ہے میں کیا چاہتا ہوں

نہیں جانتا میں کہ کیا تجھ سے مانگوں
جو میرے لیے ہو بھلا چاہتا ہوں

میں درشن گنہگار ہوں، اپنے سر پر،
تیرا پاک سایہ سدا چاہتا ہوں

○

مرا جذبِ محبت کم نہ ہو گا
جہانِ آرزو برہم نہ ہو گا

نشاطِ غم نے مجھ کو نغمگی دی
مرے دل میں کبھی ماتم نہ ہو گا

بڑھے گا میری دنیا میں اُجالا
چراغِ سوزِ غم مدھم نہ ہو گا

جہانِ آب وگِل سے ماورا بھی
ترا دردِ محبّت کم نہ ہوگا

یہ غصّہ بر بنائے مصلحت ہے
یقیں ہے دل سے وہ برہم نہ ہوگا

ترے در پر جو سر خم ہو گیا ہے
وہ اب دنیا کے آگے خم نہ ہوگا

لڑوں گا گردشِ دوراں سے درشن
میرا جوشِ عمل اب کم نہ ہوگا

○

○

کیا محبت کا انوکھا ساز ہے
دو دلوں کی ایک سی آواز ہے

بے نشاں، بے نام اس کی انتہا
زندگی آغاز ہی آغاز ہے

کل تلک دل تھا بساطِ نغمگی
آج لیکن اک شکستہ ساز ہے

خامشی کیسے چھپائے اُن سے راز
چشمِ تر جب سر بہ سر غمّاز ہے

مجھ کو مت سمجھو گدا ے میکدہ
عرشِ اعظم تک میری پرواز ہے

محو ہوں در شانِ خیالِ یار میں
مجھ کو اپنی بے خودی پر ناز ہے

○

جب سے نگہِ بد تری صیّاد پڑی ہے
دنیاے نشیمن مری برباد پڑی ہے

پیدا ہوئے تسو فتنے اُسی روز سے جس دن
بنیاد تیری عالمِ ایجاد پڑی ہے

غم لگ گئے انسان کو اس روز سے لاکھوں
جس روز سے اس عشق کی بنیاد پڑی ہے

تو آکے مرے گھر پہ مرے حال کو پوچھے
ایسی بھی تجھے کیا ستم ایجاد پڑی ہے

ہل چلتا ہے دھرتی پہ تو اُگتے ہیں شجر اور
تخریب سے تعمیر کی بنیاد پڑی ہے

اے شمع نہ کی تو نے بھی پروانے کی کچھ فکر
محتاجِ کفن میّتِ ناشاد پڑی ہے

دن رات نظر آتا ہے کچھ روز سے خاموش
درشن پہ کچھ اس طرح کی افتاد پڑی ہے

اُنہیں تھا پیہم خیالِ دنیا، وہ پاس دارِ حیا رہے ہیں
یہ مصلحت کی ہے طرفہ کاری، ضرورتاً بے وفا رہے ہیں

وہ چھین کر دل کی آرزوئیں، ہمارے دل کو مٹا رہے ہیں
کبھی جلایا تھا جس دیے کو اُسی دیے کو بُجھا رہے ہیں

کھڑے ہیں وہ بت کدے میں ہمدم میں اس کشاکش میں مبتلا ہوں
کہ بُت کو پوجوں کہ اُن کو دیکھوں جو دین و دل آزما رہے ہیں

پڑے گی شامِ فراق ہم پر تو جھیل لیں گے، ابھی سے غم کیا
ابھی تو ہے بخششِ نظارہ، ابھی وہ جلوے لٹا رہے ہیں

نہ دل میں اگلی سی بے کلی ہے، نہ آنکھ میں کانپتے ہیں آنسو
تمام آثار کہہ رہے ہیں، وہ ہم کو شاید بھُلا رہے ہیں

ہماری تعمیرِ آرزو کی حسین دنیا نہیں مکمل
ابھی تو کھینچی ہیں کچھ لکیریں، ابھی تو خاکے بنا رہے ہیں

مزا تو جب تھا چھڑا کے دنیا سے مجھ کو اپنا بنایا ہوتا
وہ خود بھی درشن نہیں ہیں میرے جو سب کو مجھ سے چھڑا رہے ہیں

○

ہجومِ غم میں ہم کو اپنا جب غم خانہ یاد آیا
جلا جو شمع کی آغوش میں پروانہ یاد آیا

غمِ دوراں نے دھندلا کر دیا تھا آئینہ دل کا
تمہیں دیکھا تو پھر بھولا ہوا افسانہ یاد آیا

بیانِ حور و جنّت کس قدر دلچسپ تھا واعظ
کبھی ساقی کی یاد آئی، کبھی میخانہ یاد آیا

نہ رندوں نے سُنا میری شکستِ دل کا افسانہ
نہ ساقی کو ملا ٹوٹا ہوا پیمانہ یاد آیا

ہوائے دامنِ گُل سے گریباں چاک ہوتا ہے
ترے کوچے میں آتے ہی دلِ دیوانہ یاد آیا

کسی کی یاد میں وارفتہ کچھ ایسا ہوا درشن
نہ پھر کعبے کی یاد آئی، نہ پھر بُت خانہ یاد آیا

وہ صنم ہم سے ہے بے وجہ خفا، کہتے ہیں
کوئی بتلاؤ، اس انداز کو کیا کہتے ہیں ؟

پہلے دِکھلائیے اُس فتنۂ محشر کو اُنہیں
حضرتِ شیخ سے پھر پوچھیے کیا کہتے ہیں

موت دراصل ہے پیغامِ وصالِ ابدی
زندگی وہ ہے جسے لوگ قضا کہتے ہیں

رقصِ دیوانگیِ شوق کے دن لوٹ آئے
پھر جنوں خیز ہے موسم کی ہوا کہتے ہیں

سنگِ خاموش ہے دل ٹوٹ نہ جائے جب تک
ٹوٹ جائے تو اسے نغمہ سرا کہتے ہیں

عشق کی بات غلط! حسن کی ہر بات حسیں!!
آپ سچ کہتے ہیں، ہاں آپ بجا کہتے ہیں

اُٹھ گیا دردِ جگر لے کے جہاں سے درشن
سونی سونی سی ہے اب بزمِ وفا کہتے ہیں

○

○

چلے جو بات تو ہم اُن سے کیا نہیں کہتے
مگر جو دل میں ہے وہ برملا نہیں کہتے

غرورِ حسن کی مستی نہ اور بڑھ جائے
صنم کو مصلحتاً ہم خدا نہیں کہتے

ہر ایک لغزشِ مستانہ اک ادا ہے تری
کسی خطا کو تری ہم خطا نہیں کہتے

گزر نہ جائے گلی سے وہ یار کی جب تک
ہوائے شام کو عاشق صبا نہیں کہتے

تجھے شہیدِ وطن مل گئی بقائے دوام
نویدِ زیست ہے، اس کو قضا نہیں کہتے

ستم شعاری تعلّق کی اک علامت ہے
ہم اہلِ ذوق تجھے بے وفا نہیں کہتے

نہ لائے رقص میں درشن جو پاکبازوں کو
ہم اس کو اُن کے کرم کی گھٹا نہیں کہتے

○

تمام نور و تجلّیٰ تمام رنگِ چمن
یہ تیرا چاند سا چہرہ یہ تیرا گل سا بدن

نہ ڈگمگائے قدم، گرچہ راہِ اُلفت میں
کہیں تھے دشت و بیاباں کہیں تھے دار و رسن

ہزار آئے زمانے میں انقلاب، مگر
مزاجِ حُسن کا بدلا نہ عشق ہی کا چلن

ثبات و صبر ضروری ہے آدمی کے لیے
شکنِ جبیں پہ نہ آئے بوقتِ رنج و محن

یہ بات اور ہے نا قدر ہے زمانہ، مگر
جہاں سے مٹ نہیں سکتے نقوشِ تیشۂ فن

مرادیار ہے مہر و وفا کا گہوارہ
عدوئے مہر و محبت کا ہے مگر مدفن

حقیقتوں سے بہر حال جو گریز کرے
وہ شاعری ہے نہ حکمت، نہ وہ ہنر ہے نہ فن

ہر اک کو جان زمانے میں اپنی پیاری ہے
عزیز تر ہے مگر ہم کو جان سے بھی وطن

بہت ہی شور تھا رنگینیٔ جہاں کا، مگر
ملا نہ ہم کو یہاں کچھ سوائے رنج و محن

وہ جانِ حسن و لطافت ہی بن کے آیا ہے
بہار غنچہ بہ غنچہ، صبا چمن بہ چمن

ہزار بار ہوا امتحانِ عشق مگر
نہ جانے حسن ہے کیوں مجھ سے بدگماں درشنؔ

بطوفِ شمعِ نورافشاں، صفِ پروانہ می آید
ہجومِ سرفروشاں بردرِ جانانہ می آید

شبِ مہتاب گلہائے چمن بے یار بے سوداست
کہ ایں اسباب خوش با جلوۂ جانانہ می آید

بسوئے میکدہ آید کسے لغزیدہ لغزیدہ
کہ لغزش در خُم و پیمانہ و میخانہ می آید

بمن چوں ساقی میخانہ چشمِ مست انداز د
چناں بینم کہ سوئے من دواں میخانہ می آید

رہِ عشق است پُر پیچ و خطر بے شبہ اے واعظ
ولے آساں شود چوں جرائتِ رندانہ می آید

بسر کردی قلندر وار دریادش اگر درشن
ہم اُو در شوقِ تو مجبور و بے تابانہ می آید

زلطفِ ساغرِ لبریز جانِ من شاد است
بیادِ بخشش پیرِ مغاں دل آباد است

چو عشق یارِ حقیقی ترا نہ بنیاد است
بداں! کہ عمرِ تو رفتہ تمام برباد است

نہ ہر کہ کوہ "کند پارہ" جوئے شیر آرد
نہ ہر کہ تیشہ بگیرد بدست، فرہاد است

گہے نظارہ بکن، داغ زارِ سینۂ من
کہ طرفہ رونقِ ایں لالہ زارِ آباد است

زحالِ زارِ منِ بے زباں چہ می پرسی
دلم بہ قبضۂ یک مہربانِ جلاّد است

سانیٹ

(ایک کم سِن بچّی کو دیکھ کر)

تیری معصومیت پہ دل قرباں، تیری آواز غیب کی آواز
تیری گفتار برقِ باطل سوز، تیرے الفاظ نغمۂ الہام
مد بھرے ہونٹ چشمۂ کوثر، تیری آنکھیں ہیں دو چھلکتے جام
تیری پازیب کی چھناچھن چھن حوروں کے رقص کی صدائے ناز

تیرے رخسار میں لطافتِ گل، پیارا پیارا یہ پھول سا ہے بدن
شادماں، بے نیازِ ننگ و نام، اُڑتی پھرتی ہے تتلیوں کی طرح
جھومتی ہے تو شاخِ گل کی طرح، ناچتی ہے تو پتلیوں کی طرح
تیرا شفاف چاند سا چہرہ، زندگی کی بہار کا درپن

یہ شرارت، یہ شوخیاں تیری، روٹھ جائے تو پیار سے مانے
تو ہے آزاد فکرِ دنیا سے جیسے آبِ رواں میں مرغابی
تو ہے پاکیزہ جوں کنول کا پھول، رنگ تیرا لطیف عنابی
ہے تو اک حورِ باغِ جنت کی، یا پری قاف کی خدا جانے

کھیلتی تھی کبھی تو گڑیوں سے کھیلے گی ایک دن دلوں سے تو
تیری سرشار نوجوانی کی منتظر ہے بہارِ رنگ و بو

○

سانیٹ

(کسی کو پنگھٹ سے پانی لاتے دیکھ کر)

جھٹپٹے کا وقت، رنگینیِ شفق کی نغمہ خواں
گھر کی جانب آ رہی ہے اک حسینہ لالہ رو
ایک ہے اس کی بغل میں، ایک ہے سر پر سبو
سادگی اور شوخیوں کا کارواں جیسے رواں

گردنِ سیمیں سے پیچاں اک دوپٹہ دلنشیں
زلف ناگن کی طرح بل کھا کے لہراتی ہوئی
لے کے عارض کی بلائیں دل کو برماتی ہوئی
دستِ عاشق جس طرح زیبِ گلوئے مہ جبیں

شوخیِ رخسار ہے رنگِ شفق سے شوخ تر
مسکراتی زیرِلب دھیمے سُروں میں نغمہ زن
شوخیِ رفتار ہے ہر گام پر کھلتے چمن
مست دیوانی جوانی، سیم بر، جادو نظر

دیکھ کر دلکش بہارِ حسن و تنویرِ شباب
شرم سے ٹیلے کے پیچھے جا چھپا ہے آفتاب

○

سانیٹ

(یاد ہے)

جانِ من! کیا تجھ کو میرا دل چرانا یاد ہے؟
تھے خرامِ ناز میں تیرے چھپے فتنے ہزار
بس گئی تھی میری نس نس میں تو اے جانِ بہار
دیکھ کر مجھ کو، وہ تیرا مسکرانا یاد ہے

تو ہی میری زیست کا سامان تھی اے میری جاں
چھُٹ کے تجھ سے ہوگئی ہے زندگی میری نڈھال
سچ بتا کیا تیرے دل میں بھی ہے میرا کچھ خیال
لٹ رہا ہے آہ! میری زندگی کا کارواں

کون تھا وہ جس سے تو نے کج ادائی سیکھ لی؟
کیا خطا میری تھی جس کی ہائے یہ تعزیر ہے؟
عشق بھی کرنا کسی سے کیا کوئی تقصیر ہے؟
کیا ملا تجھ کو جو تو نے بے وفائی سیکھ لی؟

اب تو میں ہوں، تیرا غم ہے اور مرے سینے کے داغ
اُبھی جا اب، جھلملاتا ہے محبت کا چراغ

○

سانیٹ

(بے رُخی کیوں)

بے رُخی کیوں مجھ سے آخر! میری جانِ آرزو
تیرے جلووں میں ہے رقصاں میری ساری کائنات
ہے ترا شیریں تبسم میرا سامانِ حیات
تجھ سے وابستہ مری تقدیر ہے اے خوب رو

دور ہے تو، دل کی ساتھی ہے تیری رنگین یاد
اک ہجومِ یاس، شوقِ دید، شبہائے دراز
کاروانِ آرزو، امید، حسرت، سوز و ساز
دل ہے اب اک پیکرِ غم، جو کبھی رہتا تھا شاد

اپنی آنکھوں کو، کہ جو ہیں بادۂ گلگوں کے جام
اپنے ہونٹوں کو، عطا کرتے ہیں جو لطفِ شراب
اپنے عارض کو، لطافت میں جو ہیں جانِ گلاب
وقف کر دینا ہمیشہ کے لیے شاعر کے نام

آ کہ پھر ہم چھیڑ دیں اُلفت کے نغماتِ حسیں
زندگی کے ساز پر پھر گائیں ہم اے نازنیں

○

سانیٹ

(فراقِ یار میں)

میری راتیں فراقِ یار میں بے نور ہوتی ہیں
تری کافرادائیں جانِ من، رہ رہ کے تڑپائیں
جو پیماں توڑ ڈالے تو نے، پھر رہ رہ کے یاد آئیں
زباں خاموش، دل بے چین، آنکھیں میری روتی ہیں

رواں صحرائے دل میں ہے میرے اک کاروانِ غم
خوشی کے کیف سے محروم رہتا ہے یہ دیوانہ
کہ اپنی آگ میں جلتا ہی رہتا ہے یہ پروانہ
تری شب ساغرِ رنگیں، مری شب دیدۂ پُرنم

تصوّر کا یہ عالم، آرزوؤں کی حسیں منزل
شبِ مہتاب نے چھیڑا ہے اِک نغمہ محبّت کا
کہانی اک وفاؤں کی، ترانہ اک مروّت کا
مگر اے نورِ پیکر صرف تو ہے زینتِ محفل

تصوّر کی حدوں کو توڑ کر میرے قریب آجا
مری دنیا میں رنگ و نور کے نغمات بکھرا جا

○